ISSN 2456-0375
اگست ۲۰۲۰

فلسفہ اخلاق

سے متعلق اسلامی لٹریچر کا مطالعہ

کلیش آف سویلائیزیشن

کا تنقیدی مطالعہ

Ethics

In busin
moral

نئ نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

ماہنامہ

جلد: ۳۳ شمارہ: ۸ اگست ۲۰۲۰ء ذی قعدہ/محرم الحرام ۱۴۴۲ھ

editor@rafeeqemanzil.com

₹15 | سالانہ **₹160**

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Ph: 8447622919 | Email: officermgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic Organisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor : Saud Firoz Ahmed**

خالقِ کائنات نے انسان کو خیر وشر کا شعور عطا کیا ہے تا کہ یہ جانچ سکے کہ کون شکر و بندگی کا رویہ اختیار کرتا ہے اور کون ناشکری کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً** (الدھر: ۳)

قرآنِ کریم کی اصطلاح میں شکر کا رویہ کفر کا متضاد ہے۔ یعنی اللہ کی بندگی شکر ہے اور خدا کی نافرمانی کفر ہے۔ عرشِ الٰہی تک پہنچنے کا پہلا زینہ یہ ہے کہ انسان اپنی زبان کو ذکرِ الٰہی سے تر رکھے۔ اس کی زبان سے خیر کے کلمات ہی جاری ہوں۔ دنیا کی زندگی میں نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں۔ بعض لوگ ناسمجھی میں اپنی زبان سے دوسروں کو تکلیف دے بیٹھتے ہیں۔ جبکہ اولوالالباب کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں تو فریق ثانی کو جھڑکنے کے بجائے نرم بات (قولاً میسوراً) کہتے ہیں تا کہ کسی بندۂ خدا کی دل آزاری نہ ہو۔ اسی طرح جب ان کا واسطہ جاہلوں سے پیش آتا ہے تو قالوا سلاماً کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ وہ دنیا کی چند روزہ متاعِ حیات کے پیچھے سرپٹ دوڑنے کے بجائے اپنے رب کی مغفرت کی طرف سعی و جہد کرتے ہیں۔

جنت کے طلب گاروں کو یہ تاکید بھی کی گئی ہے کہ ’’اور تیز گام ہو اپنے رب کی مغفرت اور جنت کی طرف جس کی پنہائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور خدا ترس لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو خوش حالی اور تنگی ہر حال میں خرچ

کرتے ہیں، غصہ کو پی جانے والے ہیں اور انسانوں کو معاف کردینے والے۔ اور اللہ محسنین کو محبوب رکھتا ہے۔ اور جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھتے ہیں یا (کوئی بھی گناہ کر کے) اپنے آپ پر ظلم کر لیتے ہیں تو انھیں اللہ یاد آجاتا ہے اور وہ (اللہ سے) اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا گناہوں کا معاف کرنے والا ہے بھی کون؟ اور جانتے بوجھتے (غلط) کاموں پر جمتے نہیں۔''

خداترس اور متقی انسانوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ اعلیٰ ظرف اور باحوصلہ ہوتے ہیں۔ وہ حساس دل ہوتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کی خدمت مختلف طریقوں سے کرتے ہیں اور دوسروں کی ناگوار باتوں کو بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ دوسروں کی ٹوہ میں لگنے کے بجائے اپنا محاسبہ کرتے ہیں۔ اگر کبھی ان سے کوئی ایسی ویسی حرکت سرزد ہوجاتی ہے تو اس کی توجیہ نہیں کرتے، بلکہ اپنی غلطی کو درست کرنے کی فکر کرتے ہیں اور اللہ سے معافی کے طلب گار ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن صالح کا اصل مجاہدہ خانقاہ و گوشۂ عافیت نہیں ہے، اس کی اصل آزمائش دنیا کے بھرے بازار میں ہوتی ہے جب وہ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ

دنیا میں ہوں ، دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

اللہ کے مقرب بندے تمام بندگانِ خدا کے لیے نافع ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت سے اپنے اور پرائے سبھی فیض یاب ہوتے ہیں۔ ان کا کردار دینِ اسلام کا چلتا پھرتا نمونہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینِ حق کے عاملین دنیا والوں کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ لوگ ان کے کردار کا لوہا مانتے ہیں۔ یہی ان کی اصل قوت ہوتی ہے۔ مولانا مودودیؒ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی اخلاقی قوت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''حقیقت یہ ہے کہ ان کی تلواروں نے جتنا کام کیا اس سے کہیں زیادہ کام ان کے اخلاق و کردار نے کیا چونکہ ایک ایک آدمی پورے شعور کے ساتھ اسلام کو سمجھ کر ایمان لایا تھا اور سمجھنے کے بعد پھر اس کے مطابق اس نے اپنی سیرت بنالی تھی، اس لیے جس حیثیت میں بھی انھوں نے کام کیا اس میں اسلام کی صحیح نمائندگی کی، اور اس کی وجہ سے دنیا کی کوئی طاقت ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکی۔ ان کی تلوار کی کاٹ سے پہلے ان کے اخلاق کی کاٹ لوگوں کے دلوں کے اندر اُتر چکی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جو علاقے انھوں نے فتح کیے وہاں کی آبادی ان کی سیاسی غلام نہیں بنی بلکہ ان کی مرید اور معتقد بن گئی۔ اس نے ان کا مذہب اختیار کر لیا، ان کی تہذیب قبول کر لی۔ حتیٰ کہ ان کی زبان بھی قبول کر لی۔'' (اسلام عصرِ حاضر میں، ص ۱۳)

قرآنِ حکیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی آمد کا مقصد دلوں کا تزکیہ ہے۔ اس تزکیہ کے نتیجے میں فرد، معاشرہ اور ریاست سبھی کی اصلاح ممکن ہو پاتی ہے۔

محمد معاذ

نظر

فلسفۂ اخلاق سے متعلق اسلامی لٹریچر کا جائزہ

ڈاکٹر محمد رفعت

اخلاقیات کے موضوع پر جدید اسلامی مفکرین نے جو تحقیق کی ہے، وہ دعوتِ اسلامی اور اُمت کی تعمیرِ نو کے لیے بڑی اہمیت رکھی ہے۔ چند مفکرین کی تحریروں کا تذکرہ ذیل میں کیا جارہا ہے۔

مولانا مودودیؒ کی تحریریں:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے عصرِ حاضر کے تناظر میں اخلاقیات کے موضوع پر غور کیا ہے۔ فلسفۂ اخلاق کے بنیادی مباحث کا احاطہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتاب ''اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر'' میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ''فلسفہ اخلاق'' پر مربوط گفتگو کے لیے بنیادی ایجنڈا تجویز کر دیا ہے۔ اب اس ایجنڈے کے مطابق اسلامی تصور کی تفصیلی وضاحت کا کام مسلمان مفکرین اور محققین کا ہے۔ مذکورہ کتاب میں بیان کیے گئے فلسفۂ اخلاق کے چند بنیادی سوالات درجِ ذیل ہیں:

(۱) نظامِ اخلاق اور تصورِ کائنات میں کیا تعلق ہے؟

(۲) مذہبی تصورِ کائنات میں بگاڑ کی اصل جڑ کیا ہے؟

(۳) لادینی تصورِ کائنات کی بنیادی کمزوری کیا ہے؟

(۴) وہ آخری اور انتہائی بھلائی کیا ہے، جس تک پہنچنا انسانی سعی وعمل کا مقصود ہونا چاہیے؟

(۵) انسانی طرزِ عمل کو پرکھنے کا (یعنی اسے صحیح یا غلط قرار دینے کا) معیار کیا ہے؟

(۶) خیروشر کو جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟

(۷) اخلاقی قوانین کے پیچھے قوتِ نافذہ کیا ہے؟

(۸) وہ کون سا محرک ہے جو انسان کو اپنے طبعی رجحانات کے علی الرغم اخلاقی احکام کی پابندی پر آمادہ کردے؟

مصنف نے عصری افکار کا جائزہ لیا ہے۔ مصنف کے نزدیک ان سب سوالات کا صحیح اور شافی جواب دینے میں وہ تمام اخلاقی فلسفے ناکام ثابت ہوئے ہیں، جو دنیا کے مختلف مفکرین کی جانب سے پیش کیے گئے ہیں۔ اس ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ ان فلسفوں نے اِن سوالات کی جڑ میں جو بنیادی سوال پوشیدہ ہے اس پر غور نہیں کیا ہے۔ وہ بنیادی سوال یہ ہے:

''جس کائنات میں ہم رہتے ہیں، اُس کی نوعیت کیا ہے اور اس میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟''

سوال کی اہمیت واضح ہے۔ اسلام اسی بنیادی سوال کا صحیح جواب فراہم کرتا ہے۔ اس جواب کی روشنی میں دیگر تفصیلی سوالات کے اطمینان بخش جوابات ہمیں مل جاتے ہیں۔ ان جوابات پر غور کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف فلسفوں کے ترجمان مفکرین نے جو کچھ کہا ہے وہ جزوی صداقتوں پر مشتمل ہے۔ اسلام کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اسلام اِن جزوی صداقتوں کو اپنے کلّی نقطۂ نظر کا حصہ بنالیتا ہے۔ اور ایک جامع جواب فراہم کرتا ہے۔ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر اسی جواب کا نام ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی دوسری کتاب جو فلسفۂ اخلاق سے بحث کرتی ہے، ''اخلاقیاتِ اجتماعیہ اور اس کا فلسفہ'' ہے۔ یہ مولانا کی ابتدائی تحریروں میں سے ہے۔ اس کتاب میں مختلف قدیم و جدید مفکرین کے خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے مباحث درجِ ذیل ہیں:

(۱) اخلاق کی غایتِ مقصود

(۲) فرد و جماعت کا تعلق

(۳) اخلاقیات و سیاسیات کا ربط باہمی

(۴) مسیحیت کا فلسفہ اخلاق

(۵) انسانی ضمیر پر سماج کے اثرات

(۶) عادلانہ نظامِ اخلاق کی خصوصیات

(۷) اخلاقی قوانین کی نوعیت

(۸) انسانوں کے حقوق

(۹) اخلاقی فرائض اور ذمّہ داریاں

(۱۰) محاسنِ اخلاق

(۱۱) معائبِ اخلاق

(۱۲) نیت و عمل کا تعلق

(۱۳) جزا و سزا کا کردار

(۱۴) سماجی تبدیلی اور قوت کے استعمال کے حدود

(۱۵) اخلاقی ترقی کے لامحدود امکانات اور عالمِ آخرت کی ناگزیریت

اِن عنوانات سے ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا کتاب میں فلسفہ اخلاق کے بہت سے بنیادی موضوعات کے متعلق دقیق بحث موجود ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر کا تذکرہ بین السطور میں کیا گیا ہے۔ تفصیل مولانا کی دوسری تصانیف میں ملتی ہے۔

مولانا مودودیؒ کی تیسری کتاب جس میں فلسفہ اخلاق کے ایک موضوع کا تذکرہ ہے ''اسلامی تہذیب اور اس کے اصول مبادی'' ہے۔ یہ کتاب مسلمانوں کی ایک اہم تعلیمی ضرورت کی تکمیل کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا اصل موضوع ''فلسفہ اخلاق'' نہیں ہے، بلکہ ''اسلامی تہذیب'' ہے۔ لیکن اس ضمن میں فلسفہ اخلاق کا ایک اہم سوال زیرِ بحث آ گیا ہے یعنی ''انسان کا نصب العین کیا ہے؟'' کتاب اس سوال کے سلسلے میں بڑی نفیس بحث کرتی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر کی معقولیت کو واضح کرتی ہے۔ ''نصب العین'' انسانی زندگی کے اخلاقی پہلو سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

ان کتابوں کے بعد ''مسئلہ جبر و قدر'' کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا موضوع بھی اصلاً فلسفۂ اخلاق نہیں ہے البتہ جبر و قدر کی گتھی کو سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش اُن فلسفیوں نے بھی کی ہے، جنھوں نے فلسفہ اخلاق پر کلام کیا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اپنے اصل موضوع کے ذیل میں ان کوششوں کا تذکرہ کیا ہے اور ''جبر و قدر'' کے سلسلے میں اطمینان بخش موقف پیش کرنے میں ان مفکرین کی ناکامی کے وجوہ و اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر کی معقولیت اس بحث سے واضح ہو جاتی ہے۔

مولانا مودودیؒ کی کتاب ''تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' فلسفہ اخلاق کے سلسلے میں ایک اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب اخلاق اور عملی دنیا کے تعلق کو سامنے لاتی ہے۔ اس کتاب میں ''بنیادی انسانی اخلاقیات'' اور ''اسلامی اخلاقیات'' کا فرق بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس بنیادی سوال کو پیش کرتی ہے کہ ''انقلابِ امامت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا قانون کیا ہے؟'' اس قانون کی معرفت سماجی تبدیلی کے عمل میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس سوال پر گفتگو کے بعد مولانا مودودیؒ نے اسلامی اخلاقیات کے چار مراتب کی نشاندہی کی ہے۔ یہ مراتب ہیں: ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ ان تمام اصطلاحات کے معانی محدود نہیں بلکہ پوری زندگی پر وسیع ہیں۔ ایمان کے مظاہر کا تعلق فرد و اجتماع دونوں سے ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں انسانی سرگرمیوں کی صالح تنظیم، زندہ و شعوری ایمان کا

لازمی تقاضا ہے۔ انسان کی اخلاقی و روحانی ترقی کے ان مراتب میں ایک فطری ترتیب پائی جاتی ہے اور اس ترتیب کو نظر انداز کر کے اگر صرف بعض اخلاقی جزئیات کو مرکزِ توجہ بنالیا جائے تو متوازن اور ہمہ جہتی اخلاقی ارتقاء ممکن نہیں رہتا۔

مولانا کی مشہور کتاب ''اسلام کا نظامِ حیات'' کا ایک باب ''اسلام کا اخلاقی نظام'' ہے۔ اس باب میں مولانا مودودیؒ نے موضوع کے نظری پہلو کے بجائے عملی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ اسلامی اخلاقیات کا تعلق پورے نظامِ حیات سے نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ تقریر تشکیلِ پاکستان کے بعد اُس وقت کی گئی جب ایک صالح معاشرے کی تشکیل میں ریاست کا کردار زیرِ بحث آچکا تھا۔ خود مولانا مودودیؒ اسلامی ریاست کی جانب پیش قدمی کی مہم میں عملاً مصروف تھے۔ ''اسلام کا نظامِ حیات'' میں جمع کی گئی تقاریر اس مہم سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔

موضوع کے عملی پہلو سے متعلق مولانا مودودیؒ کی ایک اور تحریر ''تعمیرِ اخلاق کیوں اور کیسے؟'' ہے۔ اس تحریر میں بتایا گیا ہے کہ کوئی انسان اپنی انفرادی حیثیت میں اور کوئی گروہ اپنی اجتماعی حیثیت میں پائیدار اخلاق کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ اخلاقی پستی کے ساتھ سرے سے کسی اسلامی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کی اخلاقی ترقی کا تمام تر انحصار توحید اور آخرت پر اُن کے پختہ یقین پر ہے۔ یہ گفتگو پورے عالمِ اسلام کے لیے اہمیت رکھتی ہے، البتہ مولانا مودودیؒ نے اس کے بعد پاکستان کی سوسائٹی کے نمایاں اخلاقی عیوب کا تذکرہ کیا ہے۔ دنیا طلبی، بددیانتی اور فرض ناشناسی ان عیوب میں سرِفہرست ہیں۔

پاکستان کی مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیتے ہوئے اخلاقی زوال کا پہلا اہم سبب مولانا نے اس نظامِ تعلیم کو قرار دیا ہے جو اسلامی تصورات اور اسلامی اقدار سے عاری ہے۔ اس کے بعد دوسرا اہم سبب ملک میں رائج غیر عادلانہ قوانین ہیں اور حکومت کی وہ مشنری ہے جو زیادہ تر بددیانت کارکنوں پر مشتمل ہے۔ اس تجزیے کے بعد مولانا نے بتایا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کی کامیابی کے لیے چند اخلاقی اوصاف درکار ہیں۔ (الف) پوری قوم میں اپنے حقوق کا صحیح شعور اور اُن کی حفاظت کا قوی ارادہ موجود ہو۔ (ب) حکومت کے کارکنوں کی کم از کم اتنی اصلاح ہوچکی ہو کہ کوئی سازشی طاقت اُن کو آئین و قانون کے خلاف استعمال نہ کرسکے اور (ج) ملک کی مجموعی فضا ایسی ہو کہ بااثر سیاسی عناصر غلط طریقوں سے کرسی اقتدار پر پہنچنے کی کوشش نہ کریں بلکہ عوام کی خدمت کر کے اُن کا اعتبار حاصل کریں۔ یہ تین شرطیں نہ پائی جائیں تو جمہوریت مفید ثابت نہیں ہوسکتی۔

پاکستان کی مسلمان سوسائٹی کا جو تجزیہ مولانا مودودیؒ نے کیا ہے وہ کم و بیش پورے عالمِ اسلام پر صادق آتا ہے۔ اخلاقی پستی سے نکلنے کے لیے مولانا کی تجاویز یہ ہیں:

(الف) قوم کے خواص میں یہ شعور پیدا ہونا چاہیے کہ تعمیرِ اخلاق کے لیے محض انفرادی سطح کی کوششیں کافی نہیں ہیں بلکہ اجتماعی سعی درکار ہے۔

(ب) تعمیرِ اخلاق کے لیے اسلامی عقائد اور اس کے نظامِ اقدار کا گہرا احترام عوام و خواص کے ذہنوں میں پیوست کرنا ضروری ہے۔

(ج) مسلمان عوام کا رشتہ اسلام سے کاٹ کر اُن کے اخلاق کی تعمیر کسی اجنبی فلسفے کی بنیاد پر کرنے کی کوشش غلط بھی ہے اور لاحاصل بھی، اس لیے کہ مسلمانوں کی اخلاقی ترقی محض اسلام کی بنیاد پر ہی ممکن ہے۔ کوئی اور فلسفہ اُن کی سوسائٹی میں اپنی جڑیں نہیں جما سکتا۔ تجربہ اس پر گواہ ہے۔

مولانا مودودیؒ کی تحریروں کے تذکرے کے بعد چند اور مفکرین کے نتائجِ تحقیق کا تعارف کرایا جارہا ہے۔

مولانا محمد فاروق خاں صاحب کا مقالہ:

فلسفہ اخلاق پر مولانا محمد فاروق خاں صاحب کا مقالہ ''حکمتِ نبوی اور حسنِ اخلاق'' اس موضوع کے چند اہم مباحث پر روشنی ڈالتا

ہے۔ مصنف نے ایک بنیادی اصطلاح ''حکمت'' کے مفہوم پر گفتگو کی ہے۔ حکمت کے معنی ہیں: ''بہترین شے کو بہترین علم کے ذریعے جاننا''۔ یاد رکھنا چاہیے کہ حکمت کی تعلیم انبیائی مشن کا اساسی عنصر ہے۔ حکمت کا ایک پہلو نظری ہے اور وہ لطافتِ ادراک، گہرے علم اور فہم و بصیرت سے عبارت ہے۔ حکمت کے دوسرے پہلو کا تعلق انسان کے جذبات کی اصلاح سے ہے۔ حکمت کا حصول اِنسانی جذبات کو صحیح رخ دیتا ہے اور اُن میں باہم ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ حکمت کا تیسرا پہلو انسان کے اخلاق کی پاکیزگی سے عبارت ہے۔ چنانچہ اہلِ عرب عقل و رائے کی پختگی اور شرافتِ اخلاق کی جامع صفت کو حکمت کا لقب دیتے تھے۔ ایسا شخص اُن کے نزدیک حکیم قرار پاتا تھا جو عاقل ہی نہیں، شریف اور مہذب بھی ہو۔ حکمت کا یہ جامع تصور اسی وقت عمل کی شکل اختیار کر سکتا ہے جب خدا کے خوف کے تحت زندگی گزاری جائے۔

حکمت کا ظہور شکر گزاری کی شکل میں ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ عین حکمت ہے کہ انسان اللہ کا شکر گزار ہو۔ حضرت لقمان کی حکیمانہ زندگی کا ابھرا ہوا پہلو شکر گزاری ہے۔ شکر کی کیفیت دین کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور دین کی تعلیمات کی جامع تعبیر بھی۔ اسی لیے شکر کے مقابل کی کیفیت کو ''کفر'' کہا گیا ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان دین کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ شکر اور کفر کی کیفیات اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

انبیائی مشن کی ایک تعبیر جہاں تعلیمِ حکمت ہے وہیں دوسری تعبیر حسنِ اخلاق کی تکمیل ہے۔ چنانچہ فطری طور پر حکمت اور حسنِ اخلاق میں گہرا تعلق ہے۔ اخلاق کا کامل اظہار یہ ہے کہ آدمی وہ تمام حقوق ادا کرے جو اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا حق خدا کا ہے یعنی تنہا اس کی عبادت کی جائے۔ اس کے بعد بالترتیب بندگانِ خدا کے حقوق ہیں جن میں والدین اور پھر درجہ بدرجہ دوسرے انسان آتے ہیں۔ ان سب سے نیک برتاؤ کیا جانا چاہیے۔

عبدالحمید صدیقی صاحب کی تصنیف:

اخلاق کے موضوع پر لکھنے والوں میں جناب عبدالحمید صدیقی صاحب کا نام شامل ہے۔ موصوف نے ''ایمان اور اخلاق'' نامی کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کے بعض اہم موضوعات درجِ ذیل ہیں:

(۱) خدا اور بندے کا تعلق
(۲) انسان کا مقصدِ حیات
(۳) معاصر مادی تہذیب کی کمزوریاں
(۴) وسائلِ حیات سے انسان کا تعلق
(۵) ذریعہ اور مقصد کی ہم آہنگی
(۶) احترامِ انسانیت اور اُس کے تقاضے
(۷) فلسفہ اجتماعیت

اِن موضوعات کے تناظر میں مصنف نے رائج نظریات کا اور مختلف تہذیبوں کے اساسی تصورات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مصنف نے تجزیے کے نتیجے میں یہ بات ثابت کی ہے کہ ان نظریات نے انسان کے فطری داعیات کا صحیح ادراک نہیں کیا۔ یہ صرف اسلام ہے جو انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس نظری بحث کی تائید میں انھوں نے ان تلخ تجربات کا حوالہ دیا ہے جن سے معاصر مادہ پرستانہ تہذیب کے غلبے کے دور میں پوری انسانیت کو دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان تلخ تجربات میں نمایاں ترین وہ اخلاقی بحران ہے جس میں دنیائے انسانیت آج مبتلا ہے۔ مصنف موجودہ اخلاقی بحران کی اصل وجہ مادہ پرستانہ تصورات کو قرار دیتے ہیں۔

اخلاقی بحران کے علاج کی نشاندہی کرتے ہوئے مصنف نے اسلام کی راہِ اعتدال کو پیش کیا ہے۔ غلط اور ناقص مادّی تصورِ کائنات کے مقابلے میں وحی والہام پر مبنی تصورِ کائنات درست بھی ہے اور کامل بھی۔ یہ تصورِ کائنات خدا اور بندے کا صحیح تعلق بتاتا ہے، انسان کے مقصدِ حیات کا تعین کرتا ہے، متاعِ دنیا سے انسان کے درست تعلق کی وضاحت کرتا ہے اور اچھے مقاصد کے لیے اچھے ذرائع

اختیار کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ الٰہی دین اسلام سے وابستگی کا تقاضا یہ ہے کہ اس جامع تصورِ کائنات کو ذہنوں میں اتارا جائے اور معاشرتی زندگی اس کی آئینہ دار ہو۔ یہ طرزِ عمل دنیا کو اخلاقی بحران سے نجات دلائے گا اور امتِ مسلمہ کے موجودہ انتشار کو بھی دور کرے گا۔

مندرجہ بالا مصنّفین کے علاوہ مولانا امین احسن اصلاحی، جناب نعیم صدیقی، مولانا عروج قادری، صدرالدین اصلاحی، مولانا سید حامد علی اور محترمہ مریم جمیلہ کی تحریروں میں اخلاقیات سے متعلق مباحث موجود ہیں۔

فلسفہ اخلاق کے تشنہ موضوعات:

اخلاقیات سے متعلق کچھ تحریروں کا ذکر کیا گیا یہ واقعہ ہے کہ اسلامی لٹریچر میں فلسفہ اخلاق کے موضوع پر تحریریں کم ہیں۔ جن پہلوؤں پر لکھا گیا ہے وہ بھی مختصر ہے، تفصیلی بحث نہیں ملتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ فلسفہ اخلاق پر تحقیق کرنے اور لکھنے کا ایک جامع منصوبہ بنایا جائے، جن موضوعات پر تحقیق کی ضرورت ہے وہ درج ذیل ہیں:

(۱) مغربی مفکرینِ اخلاق کے افکار خصوصاً فلسفہ افادیت (utilitarianism) کا تنقیدی جائزہ

(۲) لبرلزم اور اباحیت (Permissiveness) کا ابطال

(۳) اخلاقی اقدار کی تغیر پذیری کی بحث

(۴) مابعد جدیدیت (Post modernism) کے اخلاقی تصورات کا جائزہ

(۵) سائنس اور ٹکنالوجی کو اخلاقی اقدار کے تابع بنانے کی ضرورت اور اس کا طریقہ

(۶) صنعتی (industrial) اور مابعد صنعتی (post industrial) دور میں خود فراموشی (alienation) کا مسئلہ

(۷) گنجان مدنیت (urbanization) کے پیدا کردہ اخلاقی مسائل

(۸) اخلاقی حدود کے پابند بین الاقوامی نظام کا قیام

(۹) فلسفہ اخلاق اور تصورِ کائنات کا تعلق

(۱۰) جانوروں، بے جان اشیاء اور قدرتی ماحول کے حقوق

ذیل میں ان موضوعات کا مختصر تعارف کرایا جارہا ہے:

مغربی مفکرین کے افکار:

سطورِ بالا میں مولانا مودودیؒ کی کلیدی تصنیف ''اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر'' کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے فلسفہ اخلاق کے بنیادی سوالات کے سلسلے میں مغربی مفکرین کے افکار کا جائزہ لیا ہے اور معاصر فلسفوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔ بحث کا طرز مبصرانہ ہے، جائزہ مختصر ہے اور جن مفکرین کے افکار کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اُن کے نام درج نہیں کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ ''اخلاقیاتِ اجتماعیہ اور اس کا فلسفہ'' میں بھی مولانا مودودیؒ نے قدیم و جدید مفکرین کے افکار کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس کتاب میں اِن افکار پر تنقیدی نگاہ نہیں ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ ایسی محققانہ تحریروں کی ضرورت باقی ہے جن میں فلسفہ اخلاق پر کلام کرنے والے مغربی مفکرین کے خیالات کا علمی معیارات سے تنقیدی جائزہ لیا گیا ہو۔ یہ کام اب مسلمان محققین کو کرنا ہے۔

فلسفہ اخلاق سے متعلق مغرب کے اہلِ دانش کے افکار میں فلسفہ افادیت کا خصوصی تذکرہ ضروری ہے۔ مغربی مادیت سے یہ فلسفہ بڑا قریبی تعلق رکھتا ہے۔ اس کے حق میں جو استدلال پیش کیا گیا ہے اس کی قوت یا کمزوری سے قطعِ نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی کلچر سے متاثر عوام و خواص کے ذہنوں پر فلسفہ افادیت نے خاصے اثرات ڈالے ہیں۔ یوں تو افادیت کی اصطلاح مختلف پہلو رکھتی ہے۔ اس کا مفہوم مختلف معاشروں میں مختلف ہوسکتا ہے لیکن مغربی سماج میں اس کا مفہوم صرف محسوس ہونے والے مادی فوائد تک محدود ہے۔ اگر اس کو بہت وسعت دی جائے تو ایسے معنوی فوائد کی گنجائش بھی نکالی جاسکتی ہے جو سماج میں مادی فوائد کے حصول کے لیے موزوں و سازگار ماحول پیدا کریں۔ اس پس منظر کی بنا پر فلسفہ افادیت کا براہِ راست تصادم الہامی مذہب سے ہے جو مادی فوائد کے بجائے اصل قیمتی شے انسان کی تکمیلِ ذات، تزکیہ نفس،

رضائے الٰہی کے حصول اور فلاحِ آخرت کو قرار دیتا ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر فلسفہ افادیت پر بحث ضروری ہے۔ یہ فلسفہ مادی تصورِ حیات کا اہم جز ہے۔ خدا پرستانہ نظریہ حیات کی صداقت ثابت کرنے کے لیے مادی تصورِ حیات کی مدلل نفی درکار ہے۔ یہ نفی مادیت کی بنیادوں کی بھی مطلوب ہے اور اس کے اہم اجزاء کی بھی۔ فلسفہ افادیت پر تنقید اس کام کا ایک ناگزیر جز ہے۔ تحقیق کے اسلامی ایجنڈے میں اِس موضوع کو شامل کیا جانا چاہیے۔

لبرلزم:

اسلام کے خلاف پروپیگنڈے میں ایک بات بار بار دہرائی جاتی ہے وہ لبرلزم سے اسلام کا ٹکراؤ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلسفہ لبرلزم کے مطابق افرادِ انسانی کو آزادی حاصل ہے جبکہ اسلام فرد کی آزادی پر قدغن لگاتا ہے۔ اس معاملے کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے لبرلزم کی بنیادوں اور اس کے حق میں کیے جانے والے استدلال کا علمی وعقلی جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ پیشِ نظر اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر مبسوط بحث موجود نہیں ہے گرچہ مختصر اشارے مختلف مصنفین نے اپنی تحریروں میں کیے ہیں۔ اب مسلمان محققین کو اس موضوع کی جانب توجہ دینی چاہیے۔ اس موضوع کا ایک گوشہ وہ طرزِ عمل بھی ہے جو طاقتور مغربی اقوام نے قریبی تاریخ میں کمزور قوموں کے سلسلے میں اختیار کیا ہے۔ مغرب کے طاقتور گروہوں کی جانب سے جو ظلم وزیادتی نوعِ انسانی کے کمزور طبقات پر روا رکھی گئی ہے، وہ لبرلزم کے بلند بانگ دعوؤں سے ٹکراتی ہے۔ چنانچہ فلسفہ اخلاق پر اسلامی دانش وروں کو اپنی گفتگو محض نظری پہلوؤں تک محدود نہیں رکھنی چاہیے بلکہ انسانی تاریخ میں مختلف گروہوں کے طرزِ عمل کو بھی زیرِ بحث لانا چاہیے تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ مختلف اخلاقی فلسفے فی الواقع کس حد تک قابلِ عمل ہیں۔ اسلام نے جو تصورِ اخلاق پیش کیا ہے اس کے درخشاں عملی نمونے تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی اس بحث کا ایک جز ہوگا۔ اس تقابل سے صحیح نتائج تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔

فلسفہ لبرلزم پر گفتگو کے دوران یہ پہلو بھی سامنے آنا چاہیے کہ مغرب کا روایتی لبرل گروہ ہر معاملے میں انسانوں کو آزادی دینے کا قائل نہیں ہے۔ مثلاً جب اُن لوگوں کی آزادیٔ عمل کا سوال درپیش ہوتا ہے جو مغربی امپیریلزم (استعمار) کے خلاف اپنے ملکوں کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں یا اپنے معاشرے میں اپنے پسندیدہ، لیکن مغرب کے مبغوض، نظامِ سیاسی کو قائم کرنا چاہتے ہیں تو لبرلزم کے نام نہاد قائلین سخت غیر لبرل ثابت ہوتے ہیں اور ایسے افراد اور گروہوں کی آزادیٔ عمل کو سلب کر لینا چاہتے ہیں۔ یہ منظر پوری دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی صورت اس وقت پیش آتی ہے جب طاقتور قوموں کا یا غالب طبقات کا سیاسی ومعاشی مفاد خطرے میں ہوتا ہے۔ اُس وقت جو رویہ اختیار کیا جاتا ہے وہ لبرلزم کی دل کش تشریحات سے میل نہیں کھاتا۔ اس لیے یہ امر، سنجیدہ تحقیق کا مستحق ہے کہ اصولاً کن امور اور معاملات میں افراد اور گروہوں کو عمل کی آزادی حاصل ہونی چاہیے اور کتنی اور کن امور میں اس آزادی پر قدغن لگائی جانی چاہیے۔ اس طرح یہ بات بھی تنقیح طلب ہے کہ آزادیٔ فکر وعمل کو منضبط کرنے والے اخلاقی حدود کیا ہیں؟ مسلمان محققین کو ان سوالات پر توجہ کرنی چاہیے۔ اُن کے نتائجِ تحقیق سے مغرب کے اہلِ دانش اپنے مزعومات کی کمزوری کو سمجھ سکیں گے۔

اقدار کی تغیر پذیری:

اقدار کے سلسلے میں یہ حقیقت سامنے رکھنی چاہیے کہ الہامی مذہب کے مطابق اخلاقی اقدار بالفاظِ دیگر صحیح اور غلط کے پیمانے، تغیر پذیر نہیں ہیں بلکہ دائمی ہیں اس لیے کہ اُن کی بنیاد انسان کی فطرتِ صالحہ پر ہے اور ان کی تصدیق شرائع الٰہیہ نے کی ہے۔ اس کے برعکس مادی تصورِ حیات انسان کو سماجی طاقتوں کا اور خارجی حالات کا تابع ایک بے بس وجود سمجھتا ہے۔ اس تصور کے نزدیک انسانی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کی تفہیم تنہا مادی عوامل کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ انسان کے متعلق اِن دو متضاد تصورات سے تشکیل پانے والے عملی

رویے بھی باہم متضاد ہیں۔ اس صورتحال میں مسلمان محققین کی یہ ذمہ داری ہے کہ اقدار کی ماہیت کے مسئلے پر تحقیقی بحث کریں۔ یہ واقعہ ہے کہ اقدار کی تغیر پذیری کے قائلین کسی ایک خیال پر متفق نہیں ہیں بلکہ کلیدی مادی عوامل کی نشاندہی اور تاریخ انسانی کے ارتقاء میں ان عوامل کے رول کے سلسلے میں اُن کے درمیان خاصا اختلافِ رائے پایا جاتا ہے البتہ انسان کی ''انسانی'' حیثیت کا انکار وہ سب کرتے ہیں۔ اقدار کے حالات کے تابع ہونے کے حق میں کیے جانے والے ان کے استدلال کا علمی وعقلی جائزہ لیا جانا چاہیے۔ پھر مثبت انداز میں آفاقی اخلاقی اقدار کی تشریح بھی درکار ہے۔ مزید برآں وہ اصول بھی پیش کیے جانے چاہئیں جو بدلتے ہوئے حالات پر دائمی اقدار کے درست انطباق کے لیے ضروری ہیں۔ عموماً اس انطباق میں انسانی ذہن نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کی رہنمائی کی انسانیت کو ضرورت ہے۔

مابعد جدیدیت اور اخلاقی اقدار:

مابعد جدیدیت کے رجحان کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ جدیدیت کا ردِ عمل ہے۔ اس رجحان کے قائلین میں کسی منظم فکر کی تلاش بے سود ہے۔ اس لیے کہ ان کے سفر کا آغاز ہی منظم فکر کے مزعومہ جبر کے خلاف آزادی کے جذبے سے ہوا ہے۔ البتہ اُن کے افکار کا جائزہ اُن کے مزاج کی نشاندہی کرتا ہے۔ مابعد جدیدیت کے رجحان کی نوعیت ایسی ہے جو اس کے قائلین کو اخلاقی انارکی کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ دورِ جدیدیت کے مفکرین اخلاق میں گرچہ بیشتر وہ ہیں جو اقدار کی تغیر پذیری کے قائل ہیں لیکن اس کے باوجود وہ زمان و مکان کے ساتھ اقدار کی تبدیلی اور مجرد اخلاقی انارکی میں فرق کرتے ہیں۔ اس لیے مسلمان محققین کے لیے ضروری ہے کہ مابعد جدیدیت کے افکار کو مستقل طور پر زیرِ بحث لائیں۔

مابعد جدیدیت کا رجحان زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتا ہے۔ معاشرت، سیاست، ثقافت اور ادب سب کو اس نے متاثر کیا ہے۔ زندگی کے ان تمام دائروں میں اخلاقی اقدار بھی زیرِ بحث آتی ہیں، چنانچہ مابعد جدیدیت سے متاثر آراء اور رویوں کو اخلاقی حسن وقبح کے آفاقی معیارات پر پرکھنا اسلامی دانشوروں کا ایک اہم کام ہے خواہ ان آراء کے قائلین آفاقی معیاروں کو رد کرتے ہوں۔ یہ فلسفہ اخلاق پر گفتگو کا ایک زاویہ ہوگا۔ اس سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کے موقف کے علی الرغم خود فلسفہ اخلاق کی مستقل بنیادوں کا اثبات کیا جائے۔ منظم فکر کو رد کرنے کے لیے مابعد جدیدیت نے جو استدلال پیش کیا ہے اس کی کمزوریوں کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے درمیان بنیادی اختلافات کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ دونوں رجحانات مغربی مزاج کی بے اعتدالی کے مظہر ہیں۔ ایک اخلاقی اقدار میں تبدیلی کا قائل ہے تو دوسرا اُن کی یکسر نفی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ اسلامی محققین کو وہ محکم استدلال پیش کرنا ہوگا جو اس بے اعتدالی کا علاج کر سکے۔

سائنس، ٹکنالوجی اور اخلاقیات:

سائنس اور ٹکنالوجی کے سلسلے میں اسلامی مفکرین کو چند اہم سوالات پر تحقیق کرنی ہوگی۔ ان میں سے ایک سوال موجودہ مغربی سائنس کی فکری بنیادوں کا ہے جو مادیت میں پیوست ہیں۔ اسلامی مفکرین کو ثابت کرنا ہے کہ یہ فکری بنیادیں ناقص اور غلط ہیں۔ الہامی مذہب کے تصورِ کائنات پر مبنی ایک نئی سائنس کی تدوین درکار ہے۔ البتہ فلسفہ اخلاق کی بحث سے یہ سوال براہِ راست تعلق نہیں رکھتا۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے ضمن میں فلسفہ اخلاق سے براہِ راست تعلق رکھنے والا سوال سائنسی طریقِ کار (Methodology) اور اخلاقی حدود کی پابندی سے متعلق ہے۔ جن قدروں کا مغرب اس ضمن میں قائل ہے وہ صرف دو ہیں یعنی معروضیت (objectivity) اور آفاقیت (universality) مسلمان محققین کو یہ بتانا ہوگا کہ محض یہ قدریں کافی نہیں ہیں بلکہ سائنس دانوں کو صاف الفاظ میں اخلاقی معیارات کا قائل ہونا چاہیے اور یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ سائنسی تحقیق کے دوران مسلمہ اخلاقی حدود سے تجاوز روا نہیں ہے۔ اِن اخلاقی قدروں

میں احترامِ انسانیت ایک ضروری قدر ہے۔

فلسفہ اخلاق سے متعلق جو سوال مشہور و معروف ہے وہ سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال کو منضبط کرنے والی اخلاقی حدود کا ہے۔ اصولاً مغربی مفکرین بھی سائنس کے استعمال میں اخلاقی حدود کے قائل ہیں البتہ پراگندہ خیالی نے ان کی اس موضوع سے متعلق گفتگو کو تقریباً بے اثر بنادیا ہے۔ مسلمان محققین کو یہ حدود واضح کرنی ہوں گی تاکہ سائنس اور ٹکنالوجی کے حدود نا آشنا استعمال نے انسانیت کو جس اخلاقی بحران سے دوچار کر رکھا ہے اس سے دنیا کو نجات دلائی جاسکے۔

خودفراموشی(alienation):

وسائلِ حیات کا مفید اور مناسب استعمال انسان کی ناگزیر ضرورت ہے بلکہ انسان کی تکمیل ذات کا ایک اہم پہلو ہے لیکن محض یہ سرگرمی انسان کا مقصدِ وجود نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ کی تصانیف کے ذیل میں انسان کے نصب العین کا ذکر آچکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا نصب العین اپنے اندر یک گونہ تقدس کی شان رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق انسان اور خالق کے رشتے سے ہے۔ جب انسان اپنے بلند نصب العین کو بھول جاتا ہے اور محض وسائل کو استعمال کرنے والا ایک مشینی وجود بن کر رہ جاتا ہے تو اپنے آپ سے بے گانگی یا خودفراموشی (alienation) کی کیفیت اس پر طاری ہوتی ہے۔ یوں تو ہر نوع کی بے اعتدالی انسان کو اس کیفیت کی طرف لے جاسکتی ہے لیکن جو معاشرہ صنعت زدہ(industry bitten) ہوگیا ہو وہاں یہ کیفیت پیدا ہونے کا اندیشہ قوی تر ہوجاتا ہے۔ مغربی مفکرین اس مسئلے سے واقف ہیں لیکن اس کی جڑ وہ تلاش نہیں کرسکے ہیں۔ مادی تصورِ حیات کی عطا کردہ تنگ نظری انسان کی فطرت کی حقیقی معرفت میں حائل ہے۔ اس صورتحال میں مسلمان محققین اپنی تحقیقات کے ذریعے انسانیت کو اس نقطۂ اعتدال پر لاسکتے ہیں جہاں صنعت کا فروغ انسان کو خودفراموشی کی طرف نہ لے جائے۔ ایرانی مفکر علی شریعتی نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس تحقیق کو آگے بڑھایا جائے۔

گنجان مدنیت (urbanization):

مسلمان مفکرین کا ایک اہم کام آفاقی اخلاقی قدروں کا اثبات ہے۔ ان کو ایسا قوی استدلال پیش کرنا ہے جو عالمِ انسانیت کو یہ باور کراسکے کہ ہر قسم کے حالات میں اخلاقی معیارات قابلِ عمل بھی ہیں اور واجب العمل بھی۔ تجزیہ بتاتا ہے کہ اخلاقی حدود پر قائم رہنے میں تین چیزیں انسان کی مدد کرتی ہیں: (الف) صحیح تصورِ کائنات (مذہب کی زبان میں پختہ ایمان) (ب) حسنِ اخلاق کی طرف مائل کرنے والے قوی محرکات اور (ج) سازگار خارجی ماحول۔ گنجان مدنیت ان تینوں عوامل پر منفی اثر ڈالتی ہے۔ مگر خاص طور پر اس کا اثر تیسرے عامل پر پڑتا ہے۔ سکون وقرار سے محروم پیہم دباؤ کے تحت گزاری جانے والی زندگی میں جہاں انسان کو خلوت (privacy) بھی مشکل سے میسر آئے انسان کے اندر خودغرضی، نفسانیت اور سطحیت جیسی خصوصیات بآسانی جنم لینے لگتی ہیں اور صداقت و دیانت، عفت و پاکبازی، حیا و شرم اور ایثار و قربانی جیسے فضائلِ اخلاق سے وہ محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ معاصر دنیا کا تجزیہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ مسلمان دانش وروں کو اپنی تحقیق کے ذریعے وہ طریقے تجویز کرنے ہیں جن سے بے لگام مدنیت کے ڈھانچے میں ضروری اصلاحات کی جاسکیں تاکہ اس کی انسانیت کُش خصوصیات سے دنیا کو نجات مل سکے۔ اس موضوع پر معاصر مغربی لٹریچر کا جائزہ بھی ضروری ہوگا۔

بین الاقوامی نظام اور ضابطہ اخلاق:

جس طرح ہر ملک میں قانون کی حکمرانی ایک ضرورت ہے۔ اسی طرح اقوام و ممالک کو ایک دوسرے کی زیادتیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک بین الاقوامی قانون بھی ضروری ہے۔ آج کی دنیا اس ضرورت کی قائل ہے لیکن چند معاہدات، اعلانات (charters)اور عالمی اداروں کی تشکیل سے زیادہ وہ اس سمت میں پیش قدمی نہیں کرسکی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلامی دنیا کے علماء و ماہرین ابتداء سے بین الاقوامی قانون کے قائل رہے ہیں۔ انھوں نے اس قانون کی تفصیلات

مرتب کی ہیں اور خاص طور پر دنیائے اسلام اور دنیا کے دیگر خطوں کے درمیان سیاسی وقانونی تعلقات کے موضوع پر واضح روشنی ڈالی ہے۔

لیکن جس طرح کسی ملک اور سماج میں محض قانون کافی نہیں ہے بلکہ خوشگوار معاشرتی فضا کے لیے ایک ضابطہ اخلاق بھی ضروری ہے اسی طرح بین الاقوامی سطح پر ایک قانونی ڈھانچے کے علاوہ ایسے ضابطہ اخلاق کی بھی ضرورت ہے جس کے مخاطب افراد کے بجائے اقوام اور مما لک ہوں۔ آج کے مسلمان محققین کو اسلامی ہدایات وتعلیمات کی روشنی میں ایسا بین الاقوامی ضابطہ اخلاق مرتب کرنا چاہیے۔ مغربی دنیا میں اگر اس موضوع پر کچھ سوچا بھی جاتا ہے تو وہ مغرب تک ہی محدود ہوتا ہے۔ مسلمان دانش وروں کی نظر اس معاملے میں پوری دنیا تک وسیع ہونی چاہیے اور ان کا پیش کردہ ضابطہ اخلاق احترامِ انسانیت کے اسلامی تصور کا عکاس ہونا چاہیے۔ اس سمت تحقیق کرکے وہ انسانیت کی ایک بڑی خدمت انجام دیں گے۔

فلسفہ اخلاق اور تصورِ کائنات:

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اخلاقی قدریں آفاقی اور عالم گیر ہیں اور انسانی فطرت کی آواز ہیں، چنانچہ ہر فردِ انسانی سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اخلاقی حدود سے تجاوز نہ کرے لیکن یہ حقیقت کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یہ ہے کہ انسان کو اخلاقی حدود پر قائم رکھنے کے لیے قوی اندرونی محرک کا موجود ہونا ضروری ہے جو اس کو نفس کی شرارتوں کا، شیاطین جن وانس کی اکساہٹوں کا اور فساد زدہ خارجی ماحول کے مضر اثرات کا مقابلہ کرنے کے قابل بناسکے۔ یہ قوی محرک، صحیح تصور کائنات ہی سے پیدا ہوتا ہے (بالفاظِ دیگر پختہ ایمان ہی اس کی بنیاد ہے) محض فطری جذبات پر انحصار کافی نہیں۔

مسلمان محققین کا یہ کام ہے کہ فلسفہ اخلاق اور تصورِ کائنات کے اس ناگزیر تعلق کی وضاحت کریں۔ ایک طرف اُن کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ محکم اخلاقی نظام ایک مربوط تصورِ کائنات کی بنیاد پر ہی تشکیل پاسکتا ہے۔ محض اچھے مگر غیر واضح جذبات، اخلاق کے لیے کوئی قوی بنیاد فراہم نہیں کرتے۔ دوسری طرف کائنات سے متعلق مختلف تصورات کا تنقیدی جائزہ بھی مسلمان مفکرین کے کام کا ایک اہم جز ہوگا۔ ان مختلف تصورات کے درمیان ان کو صحیح و برحق تصورِ کائنات کی نشاندہی کرنی ہوگی۔ پھر اس تصور کی عملی برکات ونتائج کی تصویر بھی سامنے لانی ہوگی۔ تاریخی نظائر کے سیاق میں معاصر دنیا سے تقابل انسانوں کو صحیح نتیجے تک پہنچنے میں مدد دے گا۔

جانوروں اور بے جان اشیاء کے حقوق:

ماحولیاتی بحران کی بنا پر آج کی دنیا میں قدرتی ماحول کے تحفظ اور قدرتی وسائل کے محتاط استعمال کا بہت چرچا ہے۔ یہ مظہر خوش آئند ہے لیکن اس بظاہر معقول رویے کا اصل محرک انسان کی خودغرضی ہے۔ اس کو چشم سر سے نظر آنے لگا ہے کہ قدرتی وسائل کے بے محابا استعمال نے خود انسان کے لیے مشکلات پیدا کردی ہیں۔ اسلام اپنے مزاج کے عین مطابق قدرتی وسائل اور حیوانات ونباتات کے سلسلے میں معقول طرزِ عمل کی تعلیم دیتا ہے۔ اس تعلیم کا محرک اس حقیقت کا اِدراک ہے کہ حیوانات و نباتات اور بے جان اشیاء بھی کچھ حقوق رکھتی ہیں۔ ان حقوق کا احترام اور ادائیگی انسان کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح اپنے ابنائے نوع کے حقوق کی ادائیگی۔ حقوق کی ادائیگی محض ایک اچھی صفت کا نام نہیں ہے بلکہ انسان کے اعلیٰ اخلاق کا اہم جز ہے۔ دنیا اور اُس کے وسائل امانت ہیں جن کے سلسلے میں اِنسان کو جوابدہی کرنی ہوگی۔

مسلمان محققین کی یہ ذمہ داری ہے کہ تمام موجوداتِ عالم کے حقوق پر اسلامی ہدایات وتعلیمات کی روشنی میں تفصیلی بحث کریں۔ ان تعلیمات میں بعض قانونی نوعیت کی ہیں۔ ان کو دنیا کے قوانین کا جز بنا چاہیے۔ دیگر ہدایات اخلاقی نوعیت کی ہیں۔ اُن کو اُس اخلاقی ضابطے کا جز بنا چاہیے جس سے آگاہی عالمی انسانی ضمیر کے لیے ضروری ہے۔ اسلام کے فلسفہ اخلاق کے مندرجہ بالا موضوعات پر تحقیق اور اظہارِ خیال سے اُن کوششوں میں بڑی مدد ملے گی جو عالمی سطح پر مادیت کے سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے کی جارہی ہیں۔

نظر

Clash of Civilizations کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر محمد ارشد
اسسٹنٹ پروفیسر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ہم آج جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہ شاید اس دنیا سے بہت زیادہ مختلف ہے جو اب سے پچاس یا سو برس پہلے کی تھی۔ پچھلی چند دہائیوں کے دوران ہونے والی ترقیات نے فاصلوں کو ہی بے معنی نہیں کیا ہے بلکہ سرحدوں پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ سماجی علوم کے طالب علم کے طور پر ہی نہیں بلکہ سماج کے ایک ذمہ دار فرد کے طور پر بھی ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے آس پاس اور پوری دنیا میں وقوع پذیر ہونے والی سماجی تبدیلیوں اور ان کے اسباب کا جائزہ لیتے رہیں تاکہ ہمیں سماج کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کی ادائی میں نہ صرف یہ کہ مدد ملتی رہے بلکہ اس حوالے سے سماج میں ہمارا جو کردار ہو سکتا ہے اس کا تعین بھی ہوتا رہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ موجودات عالم کی تخلیق باری تعالیٰ نے انسان کی بھلائی اور بہبود کے لیے کی ہے لیکن یہ انسان ہی ہے جو اپنے اعمال سے نظام عالم کی تخریب کا باعث بنتا ہے۔ یہاں تک کہ بحر و بر کو بھی فساد اور بگاڑ سے بھر دیتا ہے۔

اس ذمہ دارانہ حیثیت کے سبب (جس کے حامل ہم ایک داعی امت کے فرد کے طور پر ہیں) ہمارا یہ فریضۂ منصبی بن جاتا ہے کہ ہم دنیا کو فساد اور بگاڑ کی آماجگاہ نہ بننے دیں بلکہ اسے امن و سکون کا گہوارہ بنانے میں جو تعاون بھی ہم سے ہو سکتا ہو اس سے گریز نہ کریں۔ اس ناحیے سے جب ہم غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ماضی قریب کی دنیا کو جہاں اور بہت سی چیزوں نے متاثر کیا ہے وہاں اس دوران بعض تحریریں یا کتابیں بھی ایسی منظر عام پر آئی ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ عالمی سطح پر بحث و مباحثے کے نئے دروازے کھولے ہیں بلکہ اپنے اندر موجود فکر اور نظریے کے سبب عالمی سیاست اور نظام عالم کو بھی متاثر کیا ہے۔ سموئل فلپس ہنٹگٹن کی مشہور زمانہ کتاب (۱) The Clash of Civilization and the Remaking of World Order ایک ایسا ہی کتاب ہے جس نے مستقبل کی دنیا کے منظرنامے کے حوالے سے سیاسی و سماجی دانش وری کے حلقوں میں ہل چل مچا دی ہے، سیاست کے گلیاروں میں بھی ایک طوفان برپا کرنے میں کامیاب رہی۔ اس مقالے میں کتاب کے ان مباحث کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی جو متنازع بھی رہے اور عالمی دانش وری اور سیاست کو متاثر بھی کرتے رہے ہیں۔

ہنٹنگٹن (18 اپریل 1927 تا 24 دسمبر 2008) کا پورا نام سموئل فلپس ہنٹنگٹن ہے۔ ان کی والدہ ڈورتھی سن بورن فلپس کہانی کار اور والد رچرڈ تھامس ہنٹنگٹن ہوٹلوں کے تجارتی جرائد کے پبلشر تھے۔ 18 سال کی عمر میں ایل (Yale) یونیورسٹی سے گریجویشن کیا، کچھ دنوں امریکی فوج میں خدمات انجام دیں، بعد ازاں شکاگو یونیورسٹی سے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور آخر میں هارورڈ

یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اور وہیں 23 برس کی عمر سے پڑھانا شروع کر دیا۔ ایک مختصر عرصے کو چھوڑ کر جب وہ 1952 سے لے کر 1962 تک کولمبیا یونیورسٹی سے وابستہ رہے، انھوں نے اپنی پوری عمر ہاورڈ میں تدریس و تحقیق میں گزاری۔ ہارورڈ میں وہ John M. Olin Institute for Stretagic Studies کے ڈائریکٹر اور Harvard Academy for International and Area Studies کے چیئرمین رہے۔ ایک عرصے تک وہ امریکی وزارت خارجہ کے مشیر رہے اور صدر جمی کارٹر کی انتظامیہ میں انھوں نے قومی سلامتی کونسل (National Security Council) کے لیے سلامتی سے متعلق منصوبہ بندی کے کوآرڈی نیٹر (رابطہ کار) کے فرائض انجام دیے۔ ان کی شہرت کا آغاز 1957 میں The Soldier and the State: The Theory and Politics Civil Military Relations کی اشاعت سے ہوئی، بعدازاں انھوں نے متعدد موضوعات پر کتابیں اور مضامین لکھے۔ مثلاً: Political Order in Changing Societies (1968) اور The Third Ware: Democratization in the Late Twenteeth Century (1991)۔ لیکن ان کی اصل شہرت کا آغاز 1993 میں امریکی جریدے فارن افیئرس میں ان کے مضمون The Clash of Civilizations کی اشاعت (۲) سے ہوا جس میں انھوں نے سرد جنگ کے بعد کی دنیا کے منظرنامے پر اس طور پر نظر ڈالی تھی کہ ان کے بقول آئندہ کے تنازعات کی بنیاد نظریاتی اختلافات نہ ہوکر ثقافتی اور تہذیبی اختلافات ہوں گے۔ حالاں کہ اس سے قبل انھیں کے ہم وطن فرانسس فوکویاما نے اپنی متنازع کتاب (۳) The End of History میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد نظریاتی تنازعات کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اب دنیا اس مرحلے میں داخل ہوچکی ہے جہاں امریکی نظام عالم کو نہ صرف یہ کہ پوری دنیا پر بالادستی حاصل ہوچکی ہے بلکہ اب اس کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہنٹنگٹن نے اپنے مضمون میں نئے عالمی منظرنامے پر مختلف ثقافتی و تہذیبی واقعات کو لے کر صرف سوالات قائم کیے تھے بعد میں ۱۹۹۶ء میں انھوں نے اپنے مضمون کو وسعت دے کر کتابی شکل میں شائع کیا اور اس میں ان سوالات کے جوابات واقعات و حالات کی روشنی میں دینے کی کوشش کی جو مضمون میں تشنہ چھوڑ دیے گئے تھے۔

ہنٹنگٹن کی کتاب The Clash of Civilization and the Remaking of World Order کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد کی دنیا میں ایک نئی سیاسی صف بندی کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ یہ نئی سیاسی صف بندی نظریاتی، جغرافیائی، علاقائی یا اقتصادی بنیادوں پر نہ ہوکر ثقافتی اور تہذیبی بنیادوں پر ہوگی۔ اس طرح ہنٹنگٹن نے تہذیبی تصادم کا وہ نظریہ پیش کیا جس میں آئندہ کے سیاسی تنازعات میں تہذیبی و ثقافتی وابستگیاں زیادہ اہم اور نمایاں رول ادا کریں گی۔ ہنٹنگٹن کے مطابق مستقبل میں تہذیبی شناخت کی بنیاد نسل، زبان، رنگ یا علاقہ (جغرافیہ) نہ ہوکر مذہب ہوگا، انھوں نے تہذیب کی ایک ایسی تعریف کی جس میں مذہب کو کلیدی عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ (۴) ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب میں تہذیبوں کی ایک نئی تقسیم پیش کی جس میں مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور دنیا کا آٹھ تہذیبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۵)

۱۹۹۳ء میں ہنٹنگن نے اپنے مضمون میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ ''کیا تہذیبوں کے درمیان تنازعے مستقبل کی عالمی سیاست پر حاوی رہیں گے۔'' (۶) بعد میں جب انھوں نے اپنے مضمون کی توسیع کتابی صورت میں کی تو دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے مختلف واقعات کو پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مختلف تہذیبوں کے درمیان جو تنازعے ہیں وہ کسی بھی وقت امن عالم کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ (۷) چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب کے آخری باب میں امریکہ جو دنیا میں واحد سپر پاور ہے کے ارباب حل و

عقد کو یہ مشورہ دیا کہ ’’ایک کثیر ثقافتی دنیا ناگزیر ہے کیونکہ کسی عالمی سلطنت کا قیام ناممکن ہے۔ امریکہ اور مغرب کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ مغربی شناخت کی تجدید کی جائے۔ دنیا کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ عالمی ثقافتی تکثیریت (Global Multiculturality) کو تسلیم کیا جائے۔‘‘ (۸) امریکہ کے حوالے سے اپنا مشاہدہ انھوں نے یوں بیان کیا ہے: ’’کچھ امریکیوں نے ملک میں ثقافتی تکثیریت (Multiculturlism) کو فروغ دیا ہے، کچھ نے بیرونی دنیا میں یونیورسل ازم (آفاقیت) کو فروغ دیا ہے اور کچھ نے دونوں کام کیے ہیں۔ ملک میں ملٹی کلچرل ازم سے امریکہ (ولایات متحدہ) اور مغرب دونوں کو خطرہ ہے اور بیرونی دنیا یونیورسل ازم کے فروغ سے مغرب اور دنیا کو خطرہ ہے دونوں مغربی کلچر کی انفرادیت کے انکاری ہیں۔ عالمی ملٹی کلچرل ازم کے حامی پوری دنیا کو امریکہ بنا دینا چاہتے ہیں اور ملٹی کلچرل ازم کے مقامی حامی امریکہ کو دنیا جیسا بنا دینا چاہتے ہیں۔ ایک ملٹی کلچرل امریکہ ناممکن ہے کیونکہ غیر مغربی امریکہ امریکہ ہی نہیں رہے گا۔‘‘ (۹) ہنٹنگٹن کا مشورہ یہ بھی ہے کہ ’’ایک تہذیب کی (مزعومہ) مفروضہ آفاقی خصوصیات کو فروغ دینے کے بجائے ثقافتی بقائے باہم کا تقاضا ہے کہ بیشتر تہذیبوں میں جو چیزیں مشترک ہیں انھیں تلاش کیا جائے۔ ایک کثیر تہذیبی دنیا میں تعمیری عمل یہی ہے کہ یونیورسل ازم (آفاقیت) کا اعلان (Renounce) کیا جائے، اختلاف (Diversity) کو قبول کیا جائے اور یکسانیتوں کو تلاش کیا جائے۔‘‘ (۱۰)

سموئل ہنٹنگٹن نے تہذیبی تصادم کا جو مفروضہ ۱۹۹۳ء میں پیش کیا تھا اس کی جزوی تائید بعد کے سالوں میں عالمی سیاست میں رونما ہونے والے بعض واقعات سے بھی ہوئی چنانچہ انھوں نے بوسنیا، چیچنیا، ماورائے قفقاز، وسطی ایشیا، کشمیر، مشرق وسطی، تبت، سری لنکا اور سوڈان وغیرہ ملکوں میں اس دوران جو کچھ پیش آیا ان وقوعوں سے شواہد پیش کیے۔ ہنٹنگٹن نے نہ صرف یہ کہ یہاں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو تہذیبی کشمکش (تصادم) کا حصہ قرار دیا بلکہ انھیں مستقبل کی Fault Lines سے بھی تعبیر کیا۔ ہنٹنگٹن کے مطابق مسلم دنیا کی شرح آبادی میں تیز رفتار نمو اور مشرقی ایشیا کی سبک رفتار اقتصادی ترقی دنیا میں مغرب کی اجارہ داری کے لیے بڑا چیلنج ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں عالمی سیاسی منظر نامے کو بدل رہی ہیں۔ انھوں نے چین، جاپان اور عالم اسلام کے ممکنہ اتحاد کا مفروضہ قائم کرکے ہندوستان کو امریکہ کے اتحادی کے طور پر پیش کیا ہے۔ (۱۱)

احیاء اسلام اور اس سے متعلق تحریکات اور افراد کا ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب میں خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اور اسلامی بنیاد پرستی (یہ اصطلاح مسلمانوں کی احیائی تحریکات کے لیے استعمال کرنا درست نہیں ہے) کو مغرب اور اس کی منفرد تہذیب کے لیے عظیم خطرے کے طور پر پیش کیا ہے ان کے خیال میں اسلامی بنیاد پرستی کی جڑیں موجودہ دور کی ان اسلامی تحریکات میں ہیں جو اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش کرتی ہیں اور سیاسی اسلام کی وکالت کرتی ہیں۔ انھوں نے آئندہ کے عالمی منظر نامے پر گفتگو کرتے ہوئے یہ پیش گوئی کی ہے کہ عالم اسلام کی سرحدیں خون آلود ہیں اور مستقبل میں اس کی سرحدوں پر خونیں واقعات رونما ہوں گے۔ ہنٹنگٹن کے مطابق اسلامی بیداری کے اثرات یوں تو حکمراں طبقے سے لے کر عوام تک سبھی نے قبول کیے ہیں لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر دانش وروں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں پر ہے۔ (۱۲)

سموئل ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب The Clash of Civilizations کا مرکزی موضوع ثقافت اور ثقافتی شناختوں کو قرار دیا ہے جنھیں وسیع تناظر میں تہذیبی شناختوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور سرد جنگ کے بعد پیدا ہونے والے تنازعے میں اتصال و انتشار (اتحاد و اختلاف) کے نئے طور طریقے انھیں کے ذریعہ تشکیل پارہے ہیں۔ (۱۳) پوری کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں A World of Civilization کے عنوان کے تحت یہ

بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ عالمی سیاست کثیر محوری بھی ہے اور کثیر ثقافتی بھی۔ اس باب میں ہنٹنگٹن نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ جدیدیت کا تصور مغربیت سے الگ اور مختلف ہے۔ اس کے تحت نہ تو کوئی آفاقی یا عالمی تہذیب تشکیل پانے جارہی ہے اور نہ ہی جدیدیت کا مطلب غیر مغربی معاشروں کو مغربی بنانا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان The Shifting Balance of Civilizations ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ تہذیبوں کے درمیان طاقت کے توازن میں تبدیلی آرہی ہے۔ دنیا پر مغرب کے اثرات میں کمی آرہی ہے اور غیر مغربی خاص طور پر ایشیائی تہذیبیں اپنی اقتصادی، فوجی اور سیاسی قوت میں روز بروز اضافہ کررہی ہیں۔ اسلام کو عالمی سطح پر تیزی سے فروغ حاصل ہورہا ہے اور یہ مسلم ممالک کے تعلقات کو پڑوسیوں اور غیر مغربی تہذیبوں کے ساتھ غیر مستحکم کررہا ہے۔ اسی طرح اسلام مسلم ملکوں کو خود اپنی ثقافتی اقدار سے وابستہ ہونے پر آمادہ کررہا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب The Emerging Order of Civilizations ہے۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تہذیبی بنیادوں پر ایک نیا ورلڈ آرڈر (نظام عالم) وجود میں آرہا ہے۔ دنیا کے وہ معاشرے جن میں ثقافتی ہم آہنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے لیے آگے آرہے ہیں۔ ایسی تمام کوششیں جو ایک تہذیب کو دوسرے تہذیبی معاشرے پر تھوپنے کے لیے ہورہی ہیں، انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دنیا کے تمام ملک تنظیم کے ایک نئے دور سے گزر رہے ہیں اور خود کو ان ملکوں کے اردگرد منظم کررہے ہیں جنھیں اپنی تہذیب میں رہنمائی کا مقام حاصل ہے یا جو مرکزی حیثیت کے حامل ہیں۔

چوتھے باب کا عنوان Clash of Civilizations ہے اور یہی باب اس کتاب کی روح ہے۔ اس باب میں ہنٹنگٹن نے یہ بتایا ہے کہ مغرب کا یہ تاثر دینا کہ دنیا اب ایک آفاقی نظام کے تحت آگئی ہے (جیسا کہ فوکویاما نے The End of History میں ثابت کیا ہے) اسے دوسری (غیر مغربی) تہذیبوں کے ساتھ ایک (ممکنہ) تصادم کی طرف لیے جارہا ہے۔ خاص طور پر اسلامی اور چینی تہذیبوں کو مغرب کے اس تاثر اور رویے سے بہت زیادہ پریشانی ہے۔ مقامی سطح پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو لڑائیاں جاری ہیں ان کی وجہ سے ایک دوسرے سے تہذیبی وثقافتی رشتے رکھنے والے ممالک قریب آرہے ہیں۔ یکساں تہذیبی ورثہ رکھنے والے یہ ملک اور ان کی یہ باہمی قربت کسی بھی وقت بڑے خطرے کی شکل اختیار کرسکتی ہے۔ کیونکہ ان میں Core State (کلیدی/بنیادی ریاست) کی حیثیت رکھنے والے ملکوں کا کردار بڑھتا جارہا ہے اور جب مقامی طور پر ان کے کردار میں اضافہ ہوگا تو لازمی طور پر وہ عالمی امور میں بھی اپنا رول ادا کرنا چاہیں گے۔

کتاب کا پانچواں باب The Future of Civilizations ہے۔ اس باب میں کتاب کے فاضل مصنف نے مغرب خاص طور پر امریکہ کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ فی الواقع ایک عالمی جنگ (Global War) کے خطرے سے بچنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ مغرب کے ارباب سیاست نہ صرف یہ کہ ایک کثیر ثقافتی کردار کی حامل عالمی سیاست کو تسلیم کریں بلکہ ایسے اقدامات بھی کریں جن سے دنیا میں سیاسی تکثیریت باقی اور فروغ پذیر رہے۔ ہنٹنگٹن نے مغرب کے ارباب حل وعقد کو اس باب میں یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ وہ اپنی تہذیب وثقافت کو آفاقی ثابت کرنے اور اسے پوری دنیا پر مسلط کرنے کے رجحان اور خواہش سے باز آجائیں۔ اگر وہ اپنی بقا چاہتے ہیں تو انھیں چاہیے کہ دنیا کی سبھی تہذیبوں کو اپنی علیحدہ شناخت کا حق دیں۔ اپنی تہذیب اور نظام کو دنیا پر مسلط کرنے کے مقصد سے وہ اگر خود کو متحد کرتے ہیں تو غیر مغربی معاشرے بھی ان کے مقابل ایک اتحاد بنانے کی کوشش کریں گے۔

پروفیسر ہنٹنگٹن موجودہ دور کے شاید پہلے مفکر ہیں جنھوں نے دنیا کو تہذیبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس تقسیم میں مذہب کو ایک بنیادی عامل قرار دیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مستقبل کی دنیا میں جو بھی ٹکراؤ اور تصادم کے واقعات ہوں گے وہ تہذیبوں کی بنیاد پر ہوں گے۔(۱۴) ہنٹنگٹن نے یہ پیش گوئی بھی کی ہے کہ مستقبل کا ممکنہ تہذیبی تصادم موجودہ غالب نظام، جو مغربی تہذیب کا حامل ہے، اور ان تہذیبی اکائیوں کے درمیان ہوگا جو Assertive ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف اور طاقتور ہیں۔ حالانکہ پروفیسر ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کی جو تقسیم کی ہے اس کی رو سے موجودہ دنیا میں سات یا آٹھ تہذیبیں اپنا وجود رکھتی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے (۱) مغربی تہذیب (۲) اسلامی تہذیب (۳) چینی تہذیب (۴) جاپانی تہذیب (۵) افریقی تہذیب (۶) لاطینی امریکی تہذیب (۷) آرتھوڈکس عیسائی تہذیب اور (۸) ہندو تہذیب۔ لیکن ان کے فارمولے کے تحت جن تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ اور تصادم کے امکانات پیدا ہوتے ہیں، فی الاصل ان کی تعداد تین ہے:

(۱) مغربی تہذیب، جو غالب تہذیب ہے۔

(۲) اسلامی تہذیب، جس میں تہذیبی اور ثقافتی طور پر مغربی تہذیب کو چیلنج کرنے کی صلاحیت ہے اور جو Assetive بھی ہے۔

(۳) چینی تہذیب، جو ثقافتی طور پر مالدار ہے، Assertive بھی ہے اور طاقت ور بھی ہے۔

ہنٹنگٹن نے حالات و واقعات سے نتائج اخذ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مستقبل کا متوقع تہذیبی تصادم بنیادی طور پر مغرب اور اسلام۔چینی اتحاد کے درمیان ہوگا۔ اس تصادم میں عالم اسلام اور چین تہذیبی اور ثقافتی طور پر ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہونے کے باوجود بھی مغرب کے مقابلے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ ان کے خیال میں بقیہ پانچ تہذیبیں جزوی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ یا مغرب اور دو دیگر تہذیبوں چین اور اسلام کے ساتھ ٹکرا تو سکتی ہیں البتہ ان کے درمیان یہ تصادم زیادہ شدید نہیں ہوگا۔ بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ مذکورہ متوقع تصادم میں یہ مغرب کی ہم نوا اور اس کے ساتھ ہوں گی۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ ان پانچ تہذیبوں کا مغرب کے ساتھ براہِ راست تصادم یا تو نہیں ہے یا اگر ہے تو بہت کم ہے، جب کہ اس کے مقابلے یہ اسلام یا چین کے ساتھ زیادہ متصادم ہیں۔ مثال کے طور پر لاطینی امریکی تہذیب مغرب سے زیادہ قربت اور مناسبت رکھتی ہے، آرتھوڈکس عیسائی تہذیب مغرب سے کسی حد تک متصادم ہونے کے باوجود اس کے ساتھ زیادہ قربت رکھتی ہے اور بلقان اور وسطی ایشیا کے علاقوں میں اسلام اور چین کے ساتھ اس کا تصادم نسبتاً زیادہ شدید ہے، خاص طور پر اسلام کے ساتھ۔ ہندو تہذیب کا تصادم چونکہ راست طور پر اسلام (پاکستان ایک مسلم ملک) کے ساتھ ہے لہٰذا اس کا وزن مغرب کے پلڑے میں رہے گا۔ جاپانی تہذیب کا چین کے ساتھ براہِ راست تصادم ہے گو اقتصادی طور پر اور کسی حد تک ثقافتی طور پر بھی جاپان مغرب کے لیے بھی چیلنج ہے۔ افریقی تہذیب کا بھی تصادم بنیادی طور پر اسلام کے ساتھ ہے۔

اس طرح ہنٹنگٹن کے مطابق مستقبل میں اصل تصادم مغرب اور چین اسلام اتحاد کے درمیان ہوگا، ان کے خیال میں چین اور عالم اسلام کے درمیان اس طرح کے اتحاد کا عمل شروع بھی ہو چکا ہے، چین عالم اسلام کے کئی ملکوں کی نہ صرف عسکری اور اقتصادی میدانوں میں مدد کرتا رہا ہے بلکہ سفارتی سطح پر بھی کئی معاملات میں ان کی حمایت کی ہے، خاص طور پر پاکستان کے حوالے سے، اس نے اس کا بہت زیادہ ساتھ دیا ہے۔(۱۵)

اس مختصر سے مقالے میں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فلسطین کے مسئلے پر مغربی دنیا نے جو موقف اختیار کیا ہوا ہے، اسی طرح خلیج کی جنگ کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی، اس میں مغربی دنیا کا جو رویہ رہا اور پھر 9/11 (گیارہ ستمبر

۲۰۰۱ء) کے بعد جس طرح کے حالات بنے، ان سب کا ظاہری مطالعہ اور مشاہدہ جزوی طور پر بعض مقامات پر ہنٹنگٹن کے پیش کردہ مفروضے کی تصدیق کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن موجودہ دنیا کے سیاسی حالات اور واقعات کا گہرائی کے ساتھ اگر جائزہ لیا جائے تو جن خدشات خاص طور پر تہذیبی تصادم کا تذکرہ ہنٹنگٹن نے بڑے ہی پرزور اور بظاہر مدلل انداز میں کیا ہے۔ حقیقتِ واقعہ سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ مفروضات کے طور پر وہ پرکشش ضرورت نظر آتے ہیں لیکن واقعات کی دنیا میں ان میں سے زیادہ تر کا کہیں دور دور تک بھی وجود نہیں ہے۔

مثال کے طور پر پروفیسر ہنٹنگٹن نے چین اور عالم اسلام کے مابین متوقع سیاسی اتحاد کی نہ صرف پیش گوئی کی ہے بلکہ پاکستان کے ساتھ چین کے تعلقات کو لے کر اور ۱۹۹۲ء میں ویانا عالمی کانفرنس جو انسانی حقوق کے مسئلے پر اقوام متحدہ کے بینر تلے منعقد ہوئی تھی اور جس میں کیوبا (لاطینی امریکی ملک) میانمار (بدھسٹ ملک)، سنگاپور، ویتنام، شمالی کوریا اور چین (چاروں Confuision ممالک)، ملائشیا، انڈونیشیا، پاکستان، ایران، عراق، شام، سوڈان اور جنوبی وشمالی یمن (نو مسلم ممالک) نے مغرب مخالف ایک مضبوط محاذ تشکیل دیا تھا اور کانفرنس میں زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی اور وہ اس طرح کہ جب کانفرنس کا اعلامیہ تیار ہوا تو اس میں تقریر، پریس، مظاہرے اور مذہب کی آزادی کے حق پر کوئی خاص زور نہیں دیا گیا تھا— کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلم دنیا اور چین کے درمیان اتحاد کے عمل کا آغاز ہو چکا ہے لیکن زمینی حقائق کا اگر جائزہ لیا جائے تو جس اتحاد کو پروفیسر ہنٹنگٹن نے مغرب اور اس کی منفرد تہذیب کے خلاف چینی اور اسلامی تہذیبوں کے اتحاد کا نقطۂ آغاز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ وقتی یا علاقائی ضرورت سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے۔ پاکستان کے ساتھ چین کا اتحاد اسلامی، چینی تہذیبوں کا اتحاد نہ ہو کر زیادہ علاقائی ضرورت کے تحت ہے، خطے میں چین کا مقابلہ ہندوستان سے ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تعلقات اچھے نہیں ہیں اس لیے خطے میں چین کو خود کو مضبوط رکھنے کے لیے پاکستان کے ساتھ تعلقات رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ خود ہنٹنگٹن کے الفاظ میں In politics a common enemy creats a common interest (سیاست میں مشترک دشمن مشترک مفادات کو جنم دیتا ہے)

(۲) ویسے بھی صرف چین پاکستان یا چین کے بعض دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ تجارتی وسفارتی تعلقات کو لے کر کسی نئے سیاسی اتحاد کی تشکیل کی پیش گوئی بہت دور کی کوڑی معلوم ہوتی ہے۔ مسلم دنیا میں پچھلی دو دہائیوں کے دوران جو کچھ ہوتا رہا ہے، اور جس طرح امریکہ کی قیادت میں مغربی یورپی ممالک کے اتحاد نے مسلم دنیا کے معاملات میں بے جا مداخلتوں کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ اگر چین اور مسلم دنیا کے مابین کوئی نیا سیاسی اتحاد تشکیل پا رہا ہوتا تو چین نے مسلم دنیا میں مغرب کی ان مداخلتوں کی نہ صرف مخالفت کی ہوتی بلکہ ان کے خلاف محاذ بھی بنایا ہوتا۔ پاکستان کے ساتھ جیسے مراسم چین کے ہیں اس سے کہیں زیادہ گہرے مراسم پاکستان کے امریکہ کے ساتھ ہیں اور پاکستان آج بھی خطے میں امریکہ کے اہم اتحادیوں میں شامل ہے۔ اسی طرح ویانا کانفرنس میں مغربی ممالک کے خلاف جو محاذ بنا تھا اس میں وہ ممالک ایک دوسرے سے وقتی طور پر قریب آ گئے تھے جو انسانی حقوق کے حوالے سے مغربی دنیا کے بہت سے اصولوں کو تسلیم نہیں کرتے بصورت دیگر ان میں خود بہت سارے آپسی اختلافات تھے اور ہیں مثال کے طور پر ایران اور عراق، دونوں مسلم ملک ہونے کے باوجود آپس میں شدید اختلافات رکھتے تھے۔

پروفیسر ہنٹنگٹن نے اپنے مفروضے میں سب سے زیادہ زور چین اور عالم اسلام کے ممکنہ اتحاد پر دیا ہے اور اس کی بنیاد پر ہی تہذیبی تصادم کو ناگزیر قرار دیا ہے لیکن غور کیا جائے تو چین اور عالم اسلام کے درمیان کسی ممکنہ اتحاد کی بات تو بہت دور رہی خود عالم اسلام

کے درمیان کسی اتحاد کا امکان مستقبل قریب میں نہیں کے برابر ہے۔ خود انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عالم اسلام میں کسی بھی ملک کو اسلام کے تہذیبی مرکز (Core State) کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ (۱۷) اور مسلم دنیا نہ صرف یہ کہ عدم اتحاد کا شکار ہے بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلم ممالک باہم برسر پیکار ہیں۔ ایران۔ عراق تنازعہ گزرے دنوں کی بات کہی جاسکتی ہے لیکن شام کے خلاف عرب لیگ اور خلیجی ریاستوں کا اتحاد، ایران کے اور خلیجی ریاستوں کے تنازعات، وغیرہ ایسے تنازعات ہیں جو مسلم دنیا کے کسی بھی ممکنہ اتحاد کو خارج از امکان قرار دیتے ہیں۔ مغربی دنیا کے ساتھ تعلقات کو لے کر بھی مسلم ممالک خاصے انتشار کا شکار ہیں۔ حالات اور تقاضوں کے تحت مسلم دنیا کے حکمرانوں کا ایک بڑا طبقہ مغرب کے ساتھ خوش گوار تعلقات کا حامی ہے لیکن وہ مغرب کے ساتھ تعلقات کی قیمت پر اپنے علاقائی ومقامی مفادات کی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایران میں اقتدار کی حالیہ تبدیلی کے ساتھ مغرب۔ ایران تعلقات میں جو نئی پیش رفت ہوئی ہے اور جس میں مزید بہتری کے امکانات بھی تلاش کیے جارہے ہیں، اس سے سعودی عرب اور خلیج کی ایران مخالف ریاستیں بہت زیادہ خوش نہیں ہیں اور اگر مستقبل میں ایران۔ امریکہ تعلقات اچھے ہوتے ہیں تو امریکہ اور خلیجی ریاستوں کے درمیان تعلقات پر اس کا اثر ضرور پڑے گا۔ ویسے بھی پروفیسر ہنٹنگٹن کی تمام تر تجزیاتی پیش گوئی کے باوجود مسلم دنیا کا انتشار پوری طرح مبرہن ہے۔ یہاں تک کہ مسلم دنیا میں اگر کوئی ایسی تبدیلی آتی ہے جس کے تحت ان ملکوں میں موجودہ حکمرانوں کی جگہ مغرب کے نام نہاد ناپسندیدہ افراد بھی لے لیتے ہیں تو بھی مسلم دنیا یا چین اور عالم اسلام کے کسی اتحاد کے امکانات بہت کم ہیں۔ عرب دنیا کی حالیہ سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں تیونس اور مصر میں دو ایسی حکومتیں برسراقتدار آئی تھیں جو مغرب کے لیے ناپسندیدہ ہوسکتی تھیں لیکن اقتدار میں آنے کے بعد ان کی جانب سے ایسے اقدامات سامنے نہیں آئے جو مغرب کے خلاف عالم اسلام یا عالم اسلام اور چین کی کسی نئی محاذ آرائی کا اشارہ دیتے۔ یہ حالات اور واقعات ثابت کرتے ہیں کہ مستقبل قریب میں مذہب کی بنیاد پر تہذیبوں کی تشکیل اور پھر ان کے درمیان اتحاد اور تصادم کے امکانات مفروضے کی دنیا میں تو وقوع پذیر ہوسکتے ہیں، ان کا حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابھی تک جب کہ ہنٹنگٹن کے نظریے کو سامنے آئے ہوئے دو دہائی کا عرصہ گزر چکا ہے، تہذیبی تصادم کے نام پر دانشورانہ جنگ ہی ہوتی رہی ہے۔

حواشی ومراجع:

(۱) Viking by Penguin Books India (P) Ltd., 1997

(۲) Foreign Affairs, Summer, 1993

(۳) Free Press, New York, 1st Edition, 1992

(۴) The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order, p. 102

(۵) ایضاً، 47

(۶) ایضاً، 45

(۷) ایضاً، 92-93

(۸) ایضاً، 318

(۹) ایضاً، 318

(۱۰) ایضاً، 318

(۱۱) The Indian Express, January, 20, 1998

(۱۲) The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order, p. 113

(۱۳) ایضا، 20

(۱۴) ایضاً، 245-46

(۱۵) ایضاً، 246

(۱۶) ایضاً، 185

(۱۷) ایضاً، 185

نظر

شخصیت کا ارتقاء اور اخلاقیات

فواز جاوید خان

شخصیت :

شخصیت کیا چیز ہے؟ پرسنالٹی کہتے کسے ہیں؟ انسائیکلوپیڈیا بریٹانکا کے مطابق ''سوچنے، محسوس کرنے اور برتاؤ کرنے کا وہ مخصوص طریقہ جو ایک انسان کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے اور وہ اس کے کاموں اس کی حرکتوں اور اس کے طور طریقہ سے جھلکتا ہے۔''(۱) آپ کی شخصیت ہی وہ چیز ہے جو آپ کو دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ سماج میں آپ کی حیثیت، آپ کی قیمت اور آپ کی ویلیو متعین کرتی ہے۔

شخصیت کا ارتقاء:

اب سوال یہ ہے کہ شخصیت کا ارتقاء کیا چیز ہے؟ ہر انسان یقینا اپنی قیمت کو بڑھانا چاہیگا، وہ یہ چاہیگا کہ سماج اور معاشرہ میں اس کی زیادہ سے زیادہ ویلیو ہو اور اس کے لیے وہ اپنی شخصیت کو نشو و نما دیگا۔ اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے فکر مند ہوگا۔ بالفاظ دیگر پرسنالٹی ڈیولپمنٹ کی فکر کریگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری یہ ہے کہ وہ شخصیت کے بنیادی عناصر کے ارتقاء کے لیے جدو جہد کرے۔ وہ اپنے سوچنے سمجھنے کے طریقہ کو بدلے، وہ اپنی محسوس کرنے کی صلاحیت کو صحیح رخ پر پروان چڑھائے، اس طرح بالآخر وہ لوگوں کے تئیں اپنے برتاو اور رویہ کو بدلنے میں کامیاب ہو جائیگا۔ کہ یہی تینوں شخصیت کے بنیادی عناصر ہیں۔ آپ کے سوچنے کا طریقہ، آپ کی محسوس کرنے کی صلاحیت اور لوگوں کے تئیں آپ کا رویہ۔

شخصیت کے ارتقاء کے بہت سے طریقہ کار اور ذرائع ہو سکتے ہیں۔ کچھ مثبت تو کچھ منفی۔ ہو سکتا ہے آپ کو یہ لگ رہا ہو کہ آپ کی شخصیت ارتقاء کے مدارج طئے کر رہی ہے جب کہ وہ درحقیقت تنزلی کا شکار ہو۔ تبدیلی بہر حال دو طرفہ ہوتی ہے۔ جب بھی کسی شخص یا سماج میں تبدیلی آتی ہے تو اسکا یہ مطلب قطعی نہیں ہوتا کہ اس کی شخصیت کا یا اس سماج کا ارتقاء ہو رہا ہے، بہت ممکن ہے کہ یہ تبدیلی منفی رخ پر ہو اور مزید تنزلی کا باعث بن رہی ہو۔ شخصیت کا ارتقاء کوئی منزل نہیں ہے کہ اس تک کسی بھی راستے سے ہو کر پہنچ جایا جائے بلکہ یہ ایک مستقل سفر ہے آپ کون سا راستہ اختیار کر رہے ہیں اور وہ راستہ بجائے خود کتنا صحیح ہے یہ بھی معنی رکھتا ہے۔

آخر یہ معلوم کرنے کا پیمانہ کیا ہے کہ ہماری شخصیت کا ارتقاء ہو رہا ہے یا مزید ہم تنزلی کی طرف گامزن ہیں۔ سماج میں ملنے والی مصنوعی عزت بھی کبھی آپ کی شخصیت کا حقیقی پیمانہ نہیں ہو سکتی۔ میں مصنوعی عزت اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ عموما اس بات کا اندازہ نہیں ہو پاتا کہ لوگ دل سے عزت کر رہے ہیں یا کسی مجبوری کے تحت وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ مادی اتار چڑھاؤ کو شخصیت کا پیمانہ قطعی نہیں بنایا جا سکتا۔ کیونکہ دولت اور اس میں ہونے والا اضافہ ہرگز شخصیت کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا۔ ع

> تیرے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب !
> کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک

اخلاقیات:

اخلاقیات ہی ایک ایسا پیمانہ ہے جسے حقیقی معنوں میں شخصیت کا پیمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی چیز آپ کی شخصیت اور سماج میں آپ کی حیثیت بھی متعین کریگی۔ دراصل شخصیت کا ارتقاء اور اخلاقیات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ بلند اخلاق کے مالک ہیں اور اخلاقی اقدار میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے تو یقینا آپ کی شخصیت کا بھی نشو نما ہو رہا ہے لیکن اگر آپ کی اخلاقی حالت روبہ زوال ہے تو یقینا آپ کی شخصیت بھی تنزلی کا شکار ہے۔

اخلاقیات کا حقیقی مفہوم سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ اخلاقیات کے لیے انگریزی میں ethics & morals کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں لیکن میں ان کے استعمال کو مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ

الفاظ مروجہ اصولوں پر مبنی ہیں گویا سماج اور معاشرہ میں جو رائج ہے وہی ان کے لیے ethical & moral بھی ہے ۔ جب کہ ہمارے مطابق اخلاق کوئی مروجہ چیز نہیں ہے ۔ ہر فرد شعوری طور پر اپنے اختیار اور ارادہ کے ساتھ اچھائی ، بہتری اور نیکی کو انجام دینے کے لیے جو کام کرتا ہے وہ اخلاقی کام ہے ۔ برائی یا بدی سے بچے رہنے کی کوشش کرنا بھی اخلاقیات میں شامل ہے ۔ اخلاقیات قطعی اس پر منحصر نہیں ہے کہ اور لوگ کیا کر رہے ہیں یا زمانے کا طرز عمل کیا ہے ۔ جو اخلاقی لحاظ سے غلط ہے وہ غلط ہی رہیگا چاہے ساری دنیا اس کے حق میں کیوں نہ ہو ۔ جہاں رشوت بالکل عام ہو وہاں بھی اس سے بچے رہنا اخلاق کی بلندی ہے ۔ جہاں انسانی خون بالکل سستا ہو وہاں بھی اپنے دامن کو خون کے دھبوں سے بچائے رکھنا یہ اخلاق ہے ۔ جلوؤں کے بازار میں جہاں ہر کوئی ننگا ہو وہاں بھی اپنی عزت و آبرو بچا لے جانا یہ اخلاق ہے ۔

جن لوگوں نے یہ سمجھا کہ جو رائج ہے وہی اخلاق کا تقاضا ہے انہوں کیسے بڑے بڑے جرائم کیے یہ ہمارے سامنے ہے ۔ یہودیوں کے مطابق صرف یہودیوں کی جان قیمتی ہے ۔ ان کے اخلاقی اقدار ان کو یہی سکھاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاتھ لاکھوں لاکھ غیر یہودیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں ۔ قرآن کہتا ہے کہ یہودیوں میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو امانت لوٹا دیتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک درہم نہیں لوٹاتے ، اس بددیانتی کی وجہ قران یہ بتاتا ہے کہ ان کے یہاں یہ رائج ہے کہ غیر یہودیوں کے بارے میں سوال و جواب نہیں ہوگا ، وہ آزاد ہیں ۔ (۲)

اسلامی اخلاقیات:

اسلام کے بتائے ہوئے اخلاقی اصول ہیں بہت جامع اور عالمگیر ہیں ۔ وہ کسی ایک زمانے کے لیے یا کسی ایک خاص قوم کے لیے یا ایک جگہ رہنے والوں کے لیے نہیں ہیں ۔ وہ انسان کی فطرت کو اپیل کرتے ہیں اس لیے وہی قابل عمل بھی ہیں ۔ یہ محض میرا زبانی دعویٰ نہیں ہے بلکہ آگے ہم تفصیل سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرینگے کہ کس طرح اسلامی اخلاقیات انسان کی شخصیت کو ارتقاء کی بلند ترین منازل طئے کروانے میں معاون ہوتے ہیں ۔

شخصیت کے ارتقاء میں اسلامی اخلاقیات کا کردار:

شخصیت کے ارتقاء کی راہ میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں ۔ پہلی رکاوٹ 'ذہنی تناؤ' ہے ۔ ذہنی تناؤ یا ذہنی کشمکش کے نتیجے میں انسان بے حد الجھا ہوا رہتا ہے ۔ وہ کسی ایک مقصد پر توجہ اور لگن کے ساتھ وقت نہیں دے پاتا ۔ اس کا اندرون اسے کسی کام کو لگ کر کرنے کی اجازت نہیں دیتا ۔ وہ عجیب بکھرا بکھرا اور ٹوٹا ٹوٹا سا رہتا ہے ۔ ذہنی تناؤ کا اسلام کے فلسفہ اخلاق سے بہتر حل کہیں اور نہیں ہے ۔ ذہنی تناؤ کے حد سے بڑھ جانے کے نتیجے میں ہی کوئی شخص خودکشی کرتا ہے ۔ خودکشی کا ریٹ ان ممالک میں سب سے زیادہ ہے جو دین بے زار اور تمدن کی دوڑ میں سب سے آگے ہیں ۔ خودکشی کی عالمی فہرست میں ہمیشہ یورپ اور امریکہ کے سرفہرست نظر آنے کی یہی وجہ ہے ۔ دوسری طرف جتنے مذہب پسند ممالک ہیں بالخصوص اسلامی ممالک ہیں وہاں خودکشی کا ریٹ بہت کم ہے ۔ مزید تفصیلات کے لیے آپ ایس سی ہلٹن کی مفصل رپورٹ دیکھ سکتے ہیں ۔ (۳) وجہ یہ ہے کہ اسلام نے خودکشی کو تو حرام قرار دیا ہی ہے ، (۴) ساتھ ہی خودکشی تک کھینچ کر لے جانے والے تمام دروازوں کو بھی سختی سے بند کر دیا ہے ۔

'ذہنی تناؤ' کی ایک بڑی وجہ زندگی سے مایوسی ہے ۔ وہ لوگ جن کا یہ ماننا ہے کہ یہ دنیا ہی سب کچھ ہے سارا سکھ دکھ اس دنیا تک ہی محدود ہے اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہے وہ تو اس زندگی سے مایوس ہو کر اپنی جان دے سکتے ہیں ۔ لیکن جو اس فانی دنیا سے زیادہ اس ابدی دنیا کی فکر کرتے ہوں اور ہمیشہ آخرت کا تصور ان کے سامنے ہوتا ہو ان سے خدشہ نہیں ہے کہ وہ اپنی جان یوں ہی گنوا بیٹھیں گے ۔

'ذہنی تناؤ' کی ایک بڑی وجہ مظلومیت کا احساس ہے ۔ انسان جب یہ محسوس کرتا ہے کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے ، اسے دبایا اور کچلا جا رہا ہے اور ظلم کرنے والے عیش و مستی کی زندگی گزار رہے ہیں ، کوئی ان کی فریاد رسائی کرنے والا نہیں ہے تو وہ اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں ۔ اسلام ایک تو آپ کو مظلوم بن کر جینے سے منع کرتا ہے ، حتی المقدور آپ کو اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کا سبق دیتا ہے ، نیز یہ بھی کہ ایک مظلوم مسلمان خود کو بے یار و مددگار محسوس نہیں کرتا ۔ اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ دیر سویر لیکن اس کو انصاف ملیگا ضرور ۔ اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ ظالم آج چاہے کتنا ہی خوشحال کیوں نہ ہو ، اس کو اپنا انجام بھگتنا ہی ہوگا ۔

'ذہنی تناؤ' کی ایک وجہ گھریلو تناؤ بھی ہے ۔ اس تناؤ کی عمومی وجہ کسی ایک فریق کے ناجائز تعلقات ہوتے ہیں یا فریق ثانی کی

بدگمانیاں ہوتی ہیں۔ ناجائز تعلقات روکنے کے معاملے میں اسلام جتنا سخت ہے کوئی اور مذہب نہیں۔ ناجائز تعلقات رکھنے والے کے لیے سخت ترین سزائیں ہیں۔(۵) ساتھ ہی بدگمانی سے بھی یہ کہہ کر روکا گیا ہے کہ بدگمانی گناہ کا سبب ہے۔(۶) اگر بدگمانی آگے بڑھ کر جھوٹے الزام لگانے تک پہنچ جائے تو اس کی بھی انتہائی سخت سزا قرآن بتاتا ہے۔(۷)

نوجوانوں میں 'ذہنی تناؤ' کی ایک بڑی وجہ ناسمجھی میں کیے گئے معاشقے بھی ہیں جن میں وہ تمام حدود کو پھلانگ جاتے ہیں اور پھر بھی اگر خواہش پوری نہیں ہوئی تو اپنے آپ کو نقصان پہنچا بیٹھتے ہیں۔ اسلام نہ صرف یہ کہ اس طرح کے ناجائز اور نامعقول معاشقوں سے روکتا ہے بلکہ اس کا دروازہ پوری طرح سے بند کرنے کے لیے مخالف جنس سے دوری بنانے کی بھی تاکید کرتا ہے۔(۸)

یہ وہ چند مسائل ہیں جن کی وجہ سے ایک انسان ذہنی تناؤ کا شکار رہتا ہے۔ جب تناؤ حد پار کر جاتا ہے تو وہ زندگی سے مایوس ہو کر اس دنیا کو خیرآباد کہہ دیتا ہے۔ جو شخص اس طرح کے ذہنی تناؤ کا شکار ہو اس کے لیے اپنی شخصیت کے بارے میں غور وفکر کرنا اور شخصیت کے ارتقاء کے لیے جدوجہد کرنا ناممکن ہے۔ اس تناؤ کا واحد حل اسلامی فلسفہ اخلاقیات میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر شخصیت کے ارتقاء کے لیے جدوجہد کرنا فضول ہے۔

عام نوجوانوں کے وقت کا ایک بڑا حصہ فلمیں اور اکثر فحش فلمیں دیکھنے میں صرف ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ فحش فلمیں دیکھنے والوں سے کبھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی شخصیت کے نشوونما کے لیے وقت نکال سکیں گے اور اپنی شخصیت کی تعمیر کرسکیں گے۔ اسلام کا نظریہ اخلاقیات ہر اس چیز کو دیکھنے سے روکتا ہے جو ذہن و دماغ پر مسلط ہو جائے اور اسے برائی کا گھر بنا دے، وہ مناظر چاہے اسکرین پر ہوں یا کسی پارک اور پارٹی کلب میں ہوں یا سڑک چلتے ہی کیوں نہ ہوں۔(۹) شرم وحیا اسلام کے فلسفہ اخلاقیات کا بہت بنیادی ستون ہے۔ نبیؐ کا فرمان ہے ''اگر تم میں شرم وحیا باقی نہیں ہے تو پھر تم جو چاہو کرو (ہم سے تمہارا کوئی لینا دینا نہیں ہے)''۔(۱۰) اسلام کے نظریہ اخلاق پر عمل پیرا ہونے کی برکتوں سے جو وقت انجان لڑکیوں سے بات کرنے اور فحش تصورات میں رات رات بھر جاگنے میں صرف ہوتا ہے وہ بھی بچ جائیگا۔ لوگ جب رات میں بے مصرف کاموں کے لیے جاگیں گے تو یقیناً دن سو کر ہی گزاریں گے۔ اس کا حاصل وقت کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

لوگوں کے وقت کا ایک بڑا حصہ دوسروں کی برائی کرنے اور اکثر ان کے خلاف چالیں چلنے میں برباد ہو جاتا ہے۔ ہم کو احساس بھی نہیں ہوتا اور ماہ وسال بیتتے چلے جاتے ہیں۔ جب موقعہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ ہم نے خود سے زیادہ اوروں کی فکر میں وقت برباد کر دیا اور زندگی بے مصرف ہی کھپا دی۔ نبیؐ کا فرمان ہے ''بندے کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ غیر متعلق معاملات میں نہ پڑے''۔(۱۱) جو لوگ یا جو معاملات اس سے متعلق نہ ہوں خوامخواہ اس میں اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں نہ برباد کرے۔ یہ اخلاقیات ہی ہیں جو ہمیں دوسروں کا برا چاہنے بلکہ دوسروں کا برا سوچنے سے بھی سختی سے روکتی ہیں۔ اس طرح جب آپ دوسروں کے معاملات میں نہ پڑ کر اپنے بارے میں غور وفکر کریں گے تو یقیناً آپ کے اندر اپنی شخصیت کی تعمیر کی خواہش انگڑائی لیگی اور آپ ارتقاء کے پرشوق راستے پر گامزن ہو جائینگے۔

نوجوانوں کے دن کا ایک بڑا حصہ بلکہ صحیح معنوں میں جوانی کا ایک بڑا حصہ غیر ضروری لڑائی جھگڑوں اور اوباش پنے کی حرکتوں میں گزر جاتا ہے۔ جب عمر ڈھلتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اس سب کا حاصل تو کچھ نہ تھا البتہ اس ظاہری شان وشوکت اور دکھاوے میں زندگی ایک بڑا حصہ گنوا ضرور دیا۔ اپنے وقت کا اور اپنی مصروفیات کا اخلاقی اقدار پر جائزہ لیتے رہنا انتہائی ضروری ہے۔ یہ کام آپ کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ آپ کو خود اس بات کا سخت سے سخت محاسبہ کرنا ہوگا کہ آپ کے دن بھر کی مصروفیات کیا ہیں؟ وہ آپ کو آپ کے مقصد سے قریب کر رہی ہیں یا دور کرنے کا باعث بن رہی ہیں۔ آیا آپ کی شخصیت ارتقاء کے مراحل طے کر رہی ہے یا تنزلی کا شکار ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ جب ہماری گھر والوں سے، آفس والوں سے یا ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں سے کچھ تلخیاں چل رہی ہوتی ہیں جنہیں ہم ان کے سامنے بتا بھی نہیں سکتے اور بھلانے کی کوشش بھی نہیں کرتے، جنہیں ہم اپنے دل میں پالے رہتے ہیں۔ دن بھر ہمارے ذہن و دماغ میں ایک بوجھ سا رہتا ہے، سر بھاری بھاری سا محسوس ہوتا ہے اور ہمارے وقت اور انرجی کا ایک بڑا حصہ جانے انجانے اس میں برباد ہوتا رہتا ہے۔ ایک مثال

سے سمجھئے کہ جب ہم موبائل میں یا لیپ ٹاپ میں کئی ایپ ایک ساتھ چلاتے ہیں تو سسٹم سلو ہونے لگتا ہے ہم کو وہ ساری ایپس بند کر کے ایک پر ہی فوکس کرنا پڑتا ہے اسی طرح ہماری زندگی بھی ہے۔ جب ہم بہت سارے غیر ضروری مسائل میں الجھے رہتے ہیں تو ہمارا وقت بھی برباد ہوتا ہے اور انرجی بھی۔ اسلام کا نظریہ اخلاق یہ سمجھاتا ہے کہ ہر وہ بات یا کام جو دل میں کھٹکے وہ برائی ہے اس سے بچنا اور پہلی فرصت میں اس سے دامن جھاڑنا ضروری ہے۔ برائی کی یہ ایک خاص صفت ہے کہ وہ دل میں کھٹکتی ضرور ہے۔ اور یہ کھٹک آپ کے وقت کا ایک بڑا حصہ غارت کرنے کے لیے کافی ہے۔

نفس کے تزکیہ میں اسلامی اخلاقیات کا کردار:

شخصیت کے ارتقاء کے لیے فکر مند لوگوں کے سامنے ایک اہم سوال یہ ہے کہ وہ زندگی جس میں ہم اس دنیا میں تو خوش وخرم رہ لیں لیکن آخرت کے لیے کوئی تیاری نہ کر سکیں وہ کتنی کامیاب زندگی ہوگی؟ شخصیت کا ارتقاء اس دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی فلاح کا بھی ضامن ہونا چاہیے۔ بالفاظ دیگر شخصیت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ہمیں نفس کے تزکیہ کی بھی فکر کرنی ہوگی۔ ''قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا'' (نجات پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا، ہلاک وبرباد ہو گیا وہ جس نے ضمیر کو دبائے رکھا)۔ (۱۲) شخصیت کے ارتقا پر لکھی گئی ضخیم سے ضخیم کتاب کا خلاصہ قرآن مجید کے اس ایک فرمان میں موجود ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ پرسنالٹی ڈیولپمنٹ یا شخصیت کے ارتقا کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے کیا محرک ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بنانے سنوارنے اور نکھارنے کے لیے محنتیں کرے۔ اس کے پیچھے صرف اور صرف ایک ہی وجہ ہوتی ہے اور وہ ہے کامیابی کی تلاش۔ success کی تلاش۔ مفکرین اور فلسفی حضرات آج تک کامیابی کا مفہوم متعین نہیں کر سکے نہ ہی کامیابی اور ناکامی کی حقیقت کو ہی جان سکے۔ ہر کچھ دن پر ایک فلسفی اٹھتا ہے اور کامیابی کی ایک الگ توجیہ کرتا ہے، آنے والا پچھلے والے کے خیالات کی تردید کرتا ہے اور ایک الگ نظریہ دیکر چلا جاتا۔ یہ زمانہ سے چلا آرہا ہے، آج بھی جاری ہے۔ جبکہ کامیابی اور ناکامی کے تعلق سے قرآن کا نظریہ کتنا واضح ہے ''کل نفس ذائقه الموت وانما توفون اجورکم یوم القیامه فمن زحزح عن النار وادخل الجنه فقد فاز وما الحیاه الدنیا الا متاع الغرور'' (ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ قیامت کے دن تم کو تمہارے کاموں کا بدلہ چکا دیا جائیگا۔ پس جس کو جہنم سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہو گیا۔ یہ دنیاوی زندگی تو بس ایک دھوکے کا سامان ہے) (۱۳) شخصیت کے ارتقا کی معراج یہ ہے کہ جنت میں داخلہ مل جائے اور اس کا ذریعہ یہ ہے کہ اسلامی اخلاقیات کو دانتوں میں جکڑ لیا جائے۔

اخلاقی اور غیر اخلاقی رویہ کو جانچنے کا پیمانہ:

آخر میں پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ اخلاقی اور غیر اخلاقی رویہ کو جانچنے کا پیمانہ کیا ہے؟ اسلام کے فلسفہ اخلاقیات کے مطابق اخلاقی اور غیر اخلاقی کاموں اور باتوں کو جانچنے کا جو بہترین طریقہ ہے وہ یہ کہ جو بھی دل میں کھٹکے لوگوں سے چھپانے کا خیال آئے وہ گناہ ہے اور جس پر قلبی اطمینان حاصل ہو اور ضمیر رضامند ہو وہ بھلائی ہے۔ (۱۴) خیال رہے اس کے لیے دل کا زندہ ہونا ضروری ہے، زنگ آلود دل بھلائی اور برائی میں فرق نہیں کر سکتے۔

حواشی و مراجع

(۱) https://www.britannica.com/topic/personality

(۲) سورہ آل عمران، آیت ۷۵

(۳) https://academic.oup.com/aje/article/155/5/413/171404:

(۴) سورہ البقرہ، آیت ۱۹۵

(۵) سورہ النور، آیت نمبر ۲، ۳

(۶) سورہ الحجرات، آیت نمبر ۱۲

(۷) سورہ النور، آیت نمبر ۴

(۸) سورہ النور، آیت نمبر ۳۰، ۳۱

(۹) حدیث ''العین زناها النظر والاذن زناها السمع واللسان زناه الکلام والید زناها البطش ۔۔۔'' رواہ مسلم

(۱۰) حدیث ''اذا لم تستح فاصنع ماشئت''۔ رواہ البخاری

(۱۱) حدیث ''من حسن اسلام المرء ترکہ مالایعنیہ'' حدیث حسن۔ رواہ الترمذی

(۱۲) سورہ الشمس، آیت نمبر ۹

(۱۳) سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۸۵

(۱۴) حدیث ''البر ما اطمأنت الیہ النفس واطمأن الیہ القلب الاثم ماحاک فی نفسک اترددفی الصدر'' حدیث حسن فی اسناد الامام احمد بن حنبل والدارمی۔

رشد

اللہ کا دین نوجوانوں سے کیا چاہتا ہے؟

(تحریکی جوانوں سے خطاب)

مولانا سید جلال الدین عمری

سابق امیر جماعت اسلامی ہند وصدر شریعہ کونسل جماعت اسلامی ہند

طالب علموں اور نوجوانوں کی اہمیت ہر زمانے میں رہی ہے۔ آج بھی ان کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے، جس کے ہاتھ میں جلد ہی ملک اور قوم کی باگ ڈور ہوگی۔ وہ اگر صحیح فکر اور صحیح سیرت کا حامل ہوگا تو پورے ملک کو صحیح راہ پر لے چلے گا اور وہ فکری اور عملی بے راہ روی کا شکار ہوجائے تو پوری قوم اور ملک کا رخ بھی غلط ہوجائے گا۔ نوجوان قوم کے معمار ہیں۔ ان سے اس کی قسمت وابستہ ہے۔ ان میں بعض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں، جو بڑی عمر والوں میں کم ہی پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی فکر وخیال کو قبول کرنے کی صلاحیت ان میں زیادہ ہوتی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو دور ونزدیک کی مصلحتیں اور بسا اوقات عصبیتیں کسی کو قبول کرنے سے روک دیتی ہیں۔ نوجوانوں کے مضبوط عزائم ان زنجیروں کا کاٹ سکتے ہیں۔ ان کی راہ میں بالعموم وہ چیزیں رکاوٹ نہیں بنتیں جو بڑوں کی راہ کی رکاوٹ ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں تازہ خون، نیا جوش، اور ولولہ ہوتا ہے، اس لیے کچھ کر دکھانے کا حوصلہ اور اس کی قوت و صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی تیسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ صحیح سمجھیں اس پر عمل کرتے ہیں۔ کسی فکر کو حق سمجھنا اور اس کا تعاون نہ کرنا اور خاموش بیٹھے رہنا، نوجوانوں کے مزاج کے خلاف ہے۔ وہ اس کے لیے تکلیفیں اٹھا سکتے ہیں اور قربانیاں دے سکتے ہیں۔

ان ہی اسباب کی بنا پر نوجوان ہر تحریک کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کو ہر تحریک اپنے ساتھ لینے اور ان سے طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جب کسی تحریک میں نوجوانوں کی آمد رک جاتی ہے تو وہ ختم ہوجاتی ہے۔ دنیا میں جو بڑے انقلابات آئے ان میں نوجوانوں کا ہاتھ رہا ہے۔ ان کی قربانیوں ہی نے انھیں کام یابی سے ہم کنار کیا ہے۔ انبیاء کی تاریخ بتاتی ہے کہ نوجوانوں ہی نے سب سے پہلے ان کا ساتھ دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے بندگی رب کی دعوت دی تو وہ نوجوان ہی تھے، جنھوں نے آگے بڑھ کر اسے قبول کیا اور فرعون کے ظلم وستم کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

فَمَا آمَنَ لِمُوسَى إِلاَّ ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِ عَلَى خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الأَرْضِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ (یونس: ۸۳)

(موسیٰ کو فرعون کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا۔ فرعون کے ڈر سے اور اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے۔ انھیں خوف تھا کہ فرعون ان کو عذاب میں ڈال دے گا، واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد تک رکتے نہیں تھے۔)

اصحابِ کہف نوجوان ہی تھے، جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ کے دین کی خاطر اس دنیا کے زیب و زینت اور آسائش و راحت کو چھوڑا جا سکتا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے غاروں میں پناہ لی جا سکتی ہے۔

۔ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى۔ وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَن نَّدْعُوَ مِن دُونِهِ إِلَٰهًا لَّقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا (الکھف: ۱۳۔ ۱۴)

(وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیے جب وہ اٹھے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمان اور زمین کا رب ہے۔ اسے چھوڑ کر ہم کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے، اگر ایسا کریں گے تو بالکل بے جا بات کریں گے۔)

نبیؐ کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ زیادہ تر جوانوں اور نوجوانوں ہی نے آپ کا ساتھ دیا۔ اولین صحابہ میں حضرت علیؓ سب سے کم عمر تھے، جن کی سال نو سال سے لے کر گیارہ سا تک بتائی جاتی ہے اور بڑی عمر والوں میں حضرت ابو بکر ہیں، ان کی عمر زیادہ سے زیادہ اڑتیس سال تھی۔ دو ایک کے علاوہ بیش تر صحابہ کی عمریں اس سے کم ہی تھیں۔

موجودہ دور میں کوئی بھی اسلامی تحریک نوجوانوں میں تحریک کا کام کرنا چاہتے ہیں، ان کے مسائل کو سمجھیں اور انھیں حل کرنے کی کوشش کریں۔ آج کے نوجوان جن مسائل سے دو چار ہیں، ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے:

۱۔ آج کا نوجوان ایک طرح کے ذہنی انتشار میں گرفتار ہے۔ اس کے سامنے کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی منزل۔ طرح طرح طرح کے اور متضاد نظریات نے اسے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ وہ ان نظریات کے درمیان حیرانی اور سرگشتگی کے عالم میں کھڑا ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے اور کس کا ساتھ دے؟ فکری لحاظ سے ان میں سے اس کے تمام مادی اور روحانی مسائل کو حل کر سکے۔ ایک پہلو سے وہ اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسرے سے اسے بے اطمینانی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ صاف دیکھ رہا ہے کہ ان میں سے ہر نظریہ عملی لحاظ سے اس کے لیے سخت نقصان دہ اور تباہ کن ہے۔ وہ ان کا بری طرح استحصال کرتا اور اس کی قوتوں اور صلاحیتوں سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی اسے بھلائی اور فلاح و کامیابی نظر نہیں آ رہی ہے۔

۲۔ اس وقت پوری دنیا اخلاقی بحران سے گزر رہی ہے۔ آج کا نوجوان بھی اسی بحران کا شکار ہے۔ اخلاقی اقدار انسان کو بعض اصولوں کا پابند بناتی ہیں اور اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ دنیا ہمیشہ ان اخلاقی اقدار کو دائمی قدر و قیمت رکھنے والے اقدار سمجھا ہے۔ ان کی خلاف ورزی کو وہ جرم تصور کرتی رہی ہے۔ لیکن موجودہ دور کے انسان کے نزدیک یہ اخلاقی قدریں ابدی نہیں ہیں۔ یہ سماج کی پیداوار ہیں اور سماج کے حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے قدیم اقدار پر اصرار کرنا اور ان کی پابندی کو ضروری تصور کرنا، قدامت پرستی اور بے دانشی کی دلیل ہے۔ اس تصور کے ساتھ اخلاق کی دائمی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی جس اخلاقی قدر کو چاہے دورِ جاہلیت کی یادگار کہہ کر پامال کر سکتا ہے۔

اس وقت دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو زبانی طور پر اخلاقی اقدار کی مستقل اہمیت کے قائل ہیں، لیکن عملاً ان کے نزدیک ان کی اتنی اہمیت نہیں کہ ان کے لیے کوئی بڑا نقصان برداشت کیا جائے یا کسی حاصل ہونے والے فائدے کو چھوڑ دیا جائے۔ صداقت اور راست بازی ایک اعلیٰ اخلاقی قدر ہے۔ اس کی اہمیت کو وہ تسلیم کرتے ہیں، لیکن کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے فائدے کے لیے وہ جھوٹ بول سکتے ہیں۔ یہی حال اور اخلاقی اقدار کا ہے۔ اس اخلاقی زوال کی وجہ سے کسی شخص کو کسی پر اعتماد باقی نہیں رہا ہے۔ ہر شخص دوسرے سے خوف محسوس کرتا ہے۔ آج کا نوجوان بھی اسی بے اعتمادی کی فضا میں جی رہا ہے۔ اسے نہ تو کسی کی دیانت، امانت، عہد و پیمان اور خلوص پر اعتماد ہے اور نہ کوئی دوسرا اس پر اعتماد کرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے ایک ایسی دنیا ملی ہے جو بے اصول اور اخلاق سے محروم ہے۔ وہ یہاں بے اصولی اختیار کر کے ہی کام یاب ہو سکتا ہے، ورنہ اسے قدم قدم پر نقصان اٹھانا پڑے گا۔

۳۔ آج کا ایک بڑا فتنہ جنسی آوارگی ہے۔ دورِ جدید کے فلسفوں نے انسان کو حیوان کی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ وہ حیوان کے نقطۂ نظر سے ہر مسئلے کو دیکھتا اور اسے حل کرنا چاہتا ہے۔ اسے وہ فطری نقطۂ نظر سمجھتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ جنسی اباحیت پسندی کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔ وہ حیوانوں کی طرح مکمل

جنسی آزادی چاہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک جنسی جذبات کو مذہب اور اخلاق کے نام پر دبانا غیر فطری اور نقصان دہ ہے۔ اس سے انسان کے ذہن و مزاج پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس کے لیے اس نے جنسی جذبات کو ابھارنے والا پورا ماحول تیار کر رکھا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار و رسائل، گندے اشتہارات اور گندی کتابیں، غرض نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اس ماحول کو بنانے اور ترقی دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ انسان کے اندر جوانی کے دور میں جنسی جذبات کا طبعی طور پر غلبہ رہتا ہے۔ موجودہ ماحول نے ان جذبات کو اور بھڑکا دیا ہے۔ آج کے نوجوانوں پر جنسی جنون سوار ہے اور کسی سنجیدہ کام سے انھیں دل چسپی نہیں رہ گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان جذبات کو کنٹرول کیا جاتا اور صبر و ضبط کی تعلیم دی جاتی اور اس کا عادی بنایا جاتا، لیکن اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔

۴۔ تعلیم کو موجودہ دور کی خرابیوں کا علاج سمجھا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم جیسے جیسے عام ہوگی یہ خرابیاں دور ہوتی چلی جائیں گی۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم اصلاح کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ اس سے انسان کو بنانے اور سنوارنے میں بڑی مدد ملتی ہے، لیکن موجودہ نظامِ تعلیم سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ یہ ساری خرابیاں بڑی حد تک اسی نظامِ تعلیم کی پیدا کردہ ہیں۔ جس تعلیم نے پورے معاشرے کو مسموم بنا رکھا ہو، اسے تریاق سمجھنا بہت بڑی نادانی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج یہی تعلیم عام ہو رہی ہے اور اس کے حاصل کرنے والوں کا اوسط بھی بڑھ رہا ہے۔ اگر اس سے موجودہ بگاڑ دور ہو سکتا تھا تو جس تناسب سے تعلیم پھیل رہی ہے اسی تناسب سے بگاڑ میں کمی آتی، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اس میں کوئی کمی نہیں آ رہی بلکہ روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

موجودہ نظامِ تعلیم انسان کے اندر خالص مادی نقطۂ نظر پیدا کرتا اور اسے خود غرض اور ذاتی مفاد کا عادی بناتا ہے۔ وہ اسی پہلو سے اسے دیکھتا اور اسی لحاظ سے عملی قدم اٹھاتا ہے۔ کم از کم مشرقی ملکوں میں موجود نظامِ تعلیم آدمی کو قوم و ملک اور نوعِ انسانی کا خیر خواہ تو در کنار ایک اچھا شہری بنانے میں ناکام ہے۔ اسی نظامِ تعلیم کے تحت آج کے طلبا اور نوجوانوں کی ذہنی و فکری تربیت ہو رہی ہے۔ وہ اسی کے زیرِ اثر پروان چڑھ رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہمین ایک ایسی نسل مل رہی ہے، جو صرف اپنی ذات کے لیے جی رہی ہے اور جس کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد نہیں ہے۔

یہ حالات اور مسائل طلباء اور نوجوانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بیش تر حالات سے آج کا ہر فرد دوچار ہے۔ لیکن آپ نے طلبا اور نوجوان کو اپنا میدانِ کار مقرر کیا ہے، اس کے پیش نظر چند باتیں عرض کی جا رہی ہیں:

۱۔ موجودہ دور کی ساری خرابیوں کی بنیاد یہ ہے کہ انسان کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد حیات نہیں ہے۔ مقصد حیات جتنا بلند اور پاکیزہ ہوگا اتنی ہی نیکیاں اور خوبیاں انسان کے اندر ابھریں گی اور خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پا سکے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ ایک اعلیٰ و ارفع مقصد حیات رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے اس مقصد کا خود آپ کو گہرا شعور ہونا چاہیے۔ آپ کو یہ پورا یقین ہونا چاہیے کہ وہی ایک مقصد صحیح اور حق ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے جتنے مقاصد ہیں یا ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب غلط اور باطل ہیں۔ پھر آپ کی پوری زندگی پر اپنے مقصد حیات کی گہری چھاپ ہونی چاہیے۔ آپ کی ایک ایک حرکت اور عمل سے ظاہر ہونا چاہیے کہ آپ پر اسی مقصد کی حکم رانی ہے اور آپ کے تمام اعمال اسی کے تابع ہیں۔ آپ ان ہی امور میں دل چسپی لیں، جن کی اجازت آپ کا مقصد آپ کو دے اور ان تمام امور سے کنارہ کش ہو جائیں جو اس مقصد سے متصادم ہوں۔ آپ کے فکر و عمل پر وہ اس طرح چھا جائے کہ آپ کو دیکھنے والا ہر نوجوان یہ محسوس کرے کہ آپ کی زندگی نہ تو بے مقصد ہے اور نہ کسی چھوٹے اور کم تر درجے کے مقصد کو آپ نے اختیار کر رکھا ہے۔ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے آپ نے اختیار کر رکھا ہے۔ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے آپ کی تعلیم بھی اور تربیت بھی۔ اسی کو غالب اور سر بلند کرنے کے لیے آپ سوچتے ہیں اور تگ و دو بھی کرتے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر یہ خیال ہرگز نہ ابھرنے پائے کہ دنیا کے بیش تر نوجوانوں کی طرح آپ بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ یاد رکھیے! با مقصد انسان ہی دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جو انسان کسی مقصد کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہو، جس کے اوقات اور قوت و صلاحیت اس کے لیے صرف ہو رہے ہوں، اس سے دوسرا شخص، چاہے اختلاف کرے، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اگر اسے یقین ہو جائے کہ آپ با مقصد ہی نہیں بلکہ صحیح مقصد کے حامل ہیں اور ایک پاکیزہ اور بلند منزل آپ کے سامنے ہے تو وہ آپ کا گرویدہ ہو جائے گا۔

۲۔ آپ جس مقصد کے حامل ہیں اس کا اپنے حلقۂ احباب میں

تعارف کرائیے اور مسلسل تعارف کرائیے۔ آپ کو جو بھی وقت ملے اسی کام میں صرف کیجیے۔ یہاں تک کہ آپ سے ملنے والا ہر شخص یہ سمجھ لے کہ آپ جس برتر مقصد کے تحت زندگی گزار رہے ہیں اسی کو دوسروں کی زندگی کا بھی مقصد دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت، دولت، علم اور صلاحیت جو کچھ بھی ہے اسے اسی کام میں لگائیے، پھر یہ کام نتائج سے بے فکر ہو کر انجام دیجیے۔ نتائج سے بے پرواہ ہر کر کام کرنا آسان نہیں۔ انسان جب اپنی محنت کا نتیجہ آنکھوں سے سامنے نہیں دیکھتا ہے تو اسے مایوسی ہوتی ہے اور وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ آدمی اسے اپنا فرض تصور کرے اور یہ سمجھے کہ مخاطب، چاہے میری بات قبول کرے یا نہ کرے، بہر حال مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے اور مخاطب کے انکار کی وجہ سے میرا فرض ساقط نہیں ہوجائے گا۔ اس جذبے کے ساتھ آپ کام کریں گے تو آپ کی ہمت ٹوٹے گی اور نہ آپ پر مایوسی طاری ہوگی۔ ویسے یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ اسلام کی دعوت میں بڑی جان ہے۔ یہ انسان کی فطرت سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ اگر فطرت مسخ نہ ہوئی ہو تو اس کا انکار ضمیر پر سخت گراں گزرتا ہے۔ صحیح الفطرت اسے آسانی سے رد نہیں کرسکتا۔

بہت سے نوجوان اس کام کے لیے وقت کے نہ ہونے یا اس کی کمی کا عذر کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ کوئی معقول عذر نہیں ہے۔ ذہین سے ذہین اور محنتی سے محنتی طالب علم بھی تفریح اور کھیل کود کے لیے وقت نکالتا ہے، دوستوں کے درمیان بے تکلفی اور ہنسی مذاق میں بھی وقت صرف ہوتا ہے، تھوڑا بہت غفلت کی بھی نذر ہوجاتا ہے۔ چھٹیاں بالعموم بے مقصد کاموں میں گزر جاتی ہیں۔ اگر آدمی اپنے ان ہی فاضل اوقات کو دعوت کے کام میں لگا دے تو بہت مفید نتائج برآمد ہوسکتے ہیں، جس شخص کے سامنے کوئی مقصد حیات ہو اور وہ اسے دوسروں تک پہنچانا بھی چاہتا ہو تو اپنے مصروف ترین لمحات میں بھی وہ اس کے لیے وقت نکال لے گا۔ مقصد حیات انسان کے ذہن ومزاج کو بدل دیتا ہے، اس کی دل چسپیوں کو بدل دیتا ہے، اس کے ترک واختیار کے پیمانوں اور اس کی گفتگو کے موضوعات کو بدل دیتا ہے۔ وہی وقت جس میں لوگ ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے ہیں، فلمی گانوں کے سننے اور ٹیلی وژن کے گندے پروگرام دیکھنے میں صرف کرتے ہیں، ہنسی مذاق اور ٹھٹوں میں گنواتے ہیں، سیر سپاٹوں اور تفریحوں میں ضائع کرتے ہیں، با مقصد انسان اسی کو اپنے مقصد کی تبلیغ کے لیے استعمال کرتا ہے اور ان موضوعات پر بحث اور گفتگو کے لیے استعمال کرتا ہے جو اس مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔

یہاں ایک بات ذہن میں رہے۔ وہ یہ کہ تبلیغ ودعوت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ اپنی تعلیم سے غفلت برتیں۔ اگر آپ طلباء میں کام کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ علم کے میدان میں اونچا مقام پیدا کریں۔ ایک طالب علم اسی طالب علم سے سب سے زیادہ مؤثر بلکہ مرعوب ہوتا ہے جو پڑھنے لکھنے میں فائق اور برتر ہو۔ جو طالب علم تعلیم کے میدان میں پیچھے ہو اس کا دوسرے طالب علم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ خاص کر کسی سنجیدہ طالب علم کو اگر یہ محسوس ہو کہ ایک خاص تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے آپ تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں تو وہ آپ کے قریب نہیں ہوگا اور تحریک کے بارے میں بھی اس کی رائے خراب ہوگی۔

۳۔ اسلام نے شروع ہی سے عقائد وعبادات کے بعد جس چیز پر زور دیا ہے، وہ اخلاق ہے۔ آپ قرآن مجید میں دیکھیں گے کہ جگہ جگہ ان اخلاقی اقصاف کو نمایاں کرکے دکھاتا ہے، جنھیں وہ انسان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کی پوری دعوت میں اخلاقیات اس طرح رچی بسی ہے کہ ان کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ خود بھی ان اخلاقیات کی پابندی کیجیے اور نوجوانوں کو بھی ان کا پابند بنائیے۔ دنیا کی تحریکیں اپنے غلط مقاصد کے لیے غلط طریقے سے طلباء کو استعمال کرتی ہیں، وہ ان حدود وقیود سے آزاد کردیتی ہیں، اپنے مخالفین کے خلاف بھڑکاتی ہیں، ان سے ہنگامے کراتی ہیں اور تخریب کے کام لیتی ہیں۔ لیکن آپ اس طرح کے کام نہ ان سے لے سکتے ہیں اور نہ آپ کو لینا چاہیے۔ آپ کو ان کے ذہن وفکر کو بنانا ہوگا۔ ان کو نیکی اور تقویٰ کی راہ پر لگانا ہوگا اور انھیں اس مقام تک پہنچانا ہوگا کہ وہ نیکی وتقویٰ کے علم بردار بن جائیں۔

آخری بات یہ کہ آپ کا مقصد دنیا کی کام یابی نہیں، آخرت کی کام یابی ہے۔ آپ کی ساری کوششیں اسی کے لیے ہیں۔ اس مادہ پرست دور میں آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ آج کے نوجوانوں میں یہی تصور آپ کو پیدا کرنا ہے۔ بہ ظاہر یہ بڑا مشکل کام ہے، لیکن انسان کے عزم کے سامنے کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس میں کام یابی عطا فرمائے۔

ملک کے کتنے مفاد میں نئی تعلیمی پالیسی

ڈاکٹر مشتاق احمد

کسی بھی ملک کی ترقی اور اس کی سمت و رفتار کا انحصار اس ملک کی تعلیمی پالیسی پر ہوتا ہے۔ اسی لیے عالمی سطح پر ہمیشہ یہ کوشش ہوتی رہی ہے کہ دنیا کے تمام ترقی پذیر ممالک میں معیاری تعلیم کو فروغ ملنا چاہیے۔ جہاں تک بات اپنے وطن عزیز ہندوستان کی ہے تو یہاں آزادی کے فوراً بعد یہ آواز اٹھنے لگی تھی کہ اب ہمارا ملک آزاد ہوگیا ہے اور ہمیں میکالے تعلیمی نظام سے نجات حاصل کرنی چاہیے، اس لیے 1964 میں جب کانگریس کے ایک ممبر پارلیمنٹ سدیس پرشاد نے ملک میں تعلیمی پالیسی میں تبدیلی کا مطالبہ کیا تو اس وقت کی حکومت نے یو جی سی کے چیئرمین ڈاکٹر ڈی ایس کوٹھاری کی قیادت میں ایک نئی تعلیمی پالیسی بنانے کا فیصلہ لیا اور آزاد ہندوستان کی پہلی تعلیمی پالیسی کوٹھاری کمیشن کے نام سے سامنے آئی۔ اس کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں ملک کے تعلیمی نظام میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہوا۔ پھر 1986 میں آنجہانی راجیو گاندھی نے دوسری تعلیمی پالیسی بنائی اور اسے 1992 سے نافذ کیا گیا۔ اب تیسری تعلیمی پالیسی سامنے آئی ہے جسے نئی تعلیمی پالیسی 2020 کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس تعلیمی پالیسی کا ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ اس کا مقصد ملک کے تعلیمی نظام میں ایک بڑا انقلاب پیدا کرنا ہے، بالخصوص بنیادی پرائمری تعلیم اور ثانوی تعلیم میں ایک بڑے انقلاب کی ضرورت ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ اس نئی تعلیمی پالیسی کو زمینی سطح پر عمل میں لانا آسان نہیں ہوگا اور

جب تک اس پالیسی کو عملی صورت نہیں دی جائے گی، اس وقت تک ملک کے مفاد میں یہ کارآمد نہیں ہوسکتی۔

غرض یہ کہ نئی تعلیمی پالیسی امیدوں کے چراغ تو روشن کرتی ہے لیکن اسے آندھیوں کا سامنا بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس وقت کی حکومت اپنے خاص نظریے کے تحت کام کر رہی ہے لیکن جمہوری نظام حکومت کا یہ تقاضہ ہے کہ اگر کوئی حکومت کوئی پالیسی لے کر سامنے آتی ہے تو اس پر صرف سیاست نہیں ہونی چاہیے بلکہ وہ پالیسی ملک و قوم کے مفاد میں کس قدر ضروری ہے، اس پر بحث ہونی چاہیے۔ کوئی بھی تبصرہ صرف مخالفت برائے مخالفت نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ کسی بھی پالیسی میں اگر کچھ خرابیاں ہوتی ہیں تو کچھ اچھائیاں بھی ہوتی ہیں۔ اس نئی تعلیمی پالیسی میں بھی بہت سی ایسی نئی چیزیں شامل کی گئی ہیں جو ملک و قوم کے مفاد میں ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

نئی تعلیمی پالیسی میں درجہ اول سے لے کر بارہویں درجے تک کے تعلیمی سالوں کو ۴ مدارج میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس وقت جو تعلیمی پالیسی نافذ ہے، اس میں 2+10 کا نظام تعلیم ہے جبکہ نئی تعلیمی پالیسی میں 4+3+3+5 کا اہتمام کیا گیا ہے۔ غرض کہ اب بچوں کا اسکول میں داخلہ 3 سال کی عمر میں ہوگا اور وہ 5 سال تک پرائمری تعلیم حاصل کرنے کے بعد 8 سے 11 سال کی عمر تک مڈل کی تعلیم مکمل کرے گا اور پھر وہ 11 سے 14 سال کی عمر تک میں ثانوی درجے تک کے مراحل کو طے کرے گا۔ اس کے بعد 14 سے 18 سال کی عمر تک مدت میں 10ویں اور 12ویں درجے کی تعلیم مکمل کرے گا۔ اگر اس نظام کو غور سے دیکھیں تو بہت معمولی سی تبدیلی کی گئی ہے البتہ پانچویں درجے تک مادری زبان میں تعلیم دینے کی وکالت کی گئی ہے مگر یہاں بھی حکومت سے ایک بڑی چوک ہوئی ہے کہ مادری زبان میں تعلیم کا نظام صرف سرکاری اسکولوں تک محدود رہے گا، کیونکہ اس نئی تعلیمی پالیسی میں پرائیویٹ اسکولوں کے تعلق سے کوئی ضابطہ نہیں بنایا گیا ہے جبکہ سچائی یہ ہے کہ آج ملک میں 60 سے 70 فیصد بچے پرائیویٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں میں معیاری تعلیم کا فقدان ہے۔ اس حقیقت سے ہم سب واقف ہیں کہ پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کو مختلف سرکاری کاموں میں لگایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم متاثر ہوتی ہے، ساتھ ساتھ اساتذہ کی تقرری میں بھی تعلیمی معیار کو سامنے نہیں رکھا جاتا۔ ہر سال جب پرائمری اسکولوں کے طلبا کی رپورٹ شائع ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ 8ویں درجے کے طالب علم کسی بھی زبان کی کتاب نہیں پڑھ سکتے، سائنس و حساب کے معاملے میں بھی وہ بہت معمولی واقفیت رکھتے ہیں۔ اس نئی تعلیمی پالیسی میں معیار و وقار کی بحالی کا وعدہ کیا گیا ہے مگر جب تک اسکولوں میں معیاری اساتذہ نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک معیاری تعلیم کی فضا سازگار نہیں ہوسکتی۔ شاید اس لیے حکومت نے اب 4 سالہ بی ایڈ کورس کے نفاذ کا اعلان کیا ہے۔ اگر اس پر واقعی ایماندارانہ عمل ہوتا ہے تو پرائمری اور ثانوی تعلیم کی صورت بہتر ہوسکتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے جب تک پرائمری اور ثانوی تعلیم کا معیار بلند نہیں ہوگا، اس وقت تک اعلیٰ تعلیم کی دنیا بھی نہیں بدل سکتی۔ واضح ہو کہ جب اس نئی تعلیمی پالیسی کا مجوزہ خاکہ پیش ہوا تھا، اس کے چیئرمین پروفیسر کستوری رنگن بنائے گئے تھے جو اِسرو یعنی انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن کے چیئرمین تھے۔ انھوں نے ملک کے عوام سے مشورہ طلب کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے بھی اس مہم میں حصہ لیا تھا اور پرائمری تعلیم کے میڈیم کے لیے مادری زبان کی وکالت کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ووکیشنل ایجوکیشن کی ضرورت پر روشنی ڈالی تھی۔ اس نئی تعلیمی پالیسی میں ان دونوں نکات کو شامل کیا گیا ہے۔

گاندھی جی نے بیشک اس بات پر زور دیا تھا کہ اسکولوں میں بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی ضروریات کی چیزوں کو بنانے کی

ٹریننگ بھی دی جائے لیکن حالیہ دو تین دہائیوں میں اس کی طرف توجہ کم رہی ہے۔ اب اس نئی تعلیمی پالیسی میں اسکولی طلبہ کو پروفیشنل تعلیم سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے کہ گلوبلائزیشن کے بعد بازار میں روزگار کے لیے اور خود انحصاری کے لیے ووکیشنل اور پروفیشنل تعلیم ضروری ہے۔ جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا سوال ہے تو کالجوں میں بھی 4 سالہ ڈگری کورس نافذ کرنے کی بات کہی گئی ہے اور یہ سہولت دی گئی ہے کہ اگر کوئی طالب علم ایک سال کے بعد بھی پڑھائی چھوڑ دیتا ہے تو اسے سرٹیفکیٹ کورس کی سند دی جائے گی اور 2 سال کے بعد ڈپلومہ اور 3 سال مکمل کرنے والے گریجویٹ کہلائیں گے جب کہ 4 سال مکمل کرنے کے بعد وہ پی ایچ ڈی ریسرچ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ریسرچ کے معیار کو بلند کرنے کے لیے بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے اور ریسرچ فنڈنگ یعنی آر ایف اے بنایا گیا ہے۔ حالتہ دنوں میں ہمارے ریسرچ کا معیار بہت پست ہوا ہے جس کی وجہ سے عالمی یونیورسٹیوں کے مقابلے ہم اپنی شناخت مستحکم نہیں کر سکے ہیں، اس لیے یہ ضروری قدم ہے مگر یو جی سی، این سی ای آر ٹی، اے ای سی ٹی وغیرہ اداروں کو ختم کر کے صرف ایک کمیشن یعنی ہائر ایجوکشن کمیشن آف انڈیا تشکیل دینا تعلیمی شعبے میں شخصی اہمیت کو فروغ دینے کے مانند ہے۔ اس سے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں افراتفری کا ماحول پیدا ہوگا۔ اسی طرح غیر ملکی تعلیمی اداروں کو ملک میں آزادانہ تعلیمی مراکز قائم کرنے کی اجازت دینا ملک کے پسماندہ طبقے اور دیہی علاقے کے طلبا کے لیے نقصاندہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کالجوں کو بھی 3 زمرے میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کالجوں کو یہ اختیار دیا جا رہا ہے کہ وہ خود مختار ہوں گے، سرٹیفکیٹ بھی دیں گے۔ اس سے بھی افراتفری کا ماحول پیدا ہوگا اور بدعنوانی کو فروغ مل سکتا ہے۔ چونکہ اس نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ میں کافی وقت لگے گا، اس لیے اس میں جو کمیاں ہیں، اس کو دور کیا جا سکتا ہے مگر افسوس ہے کہ ان دنوں ملک میں جس طرح کی سیاسی فضا قائم ہوئی ہے اور بالخصوص ذرائع ابلاغ نے حکومت کی ہر پالیسی کی آنکھ بند کر کے حمایت کی ہے، اس سے ایسا لگتا ہے کہ حکومت اس میں اب کوئی تبدیلی نہیں کرے گی جو ملک کے لیے خسارہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ڈیجیٹل تعلیم کو فروغ دینے کے لیے نیشنل ایجوکیشنل ٹیکنالوجی فورم تشکیل دینے کی بات کہی جا رہی ہے۔ یہ ایک اچھی کوشش ہے، کیونکہ اکیسویں صدی کی دنیا میں ڈیجیٹل تعلیم کی اہمیت وافادیت مسلم ہے اور ہندوستان میں اس کی طرف توجہ کم دی گئی ہے۔ اس نئی تعلیمی پالیسی میں گراس آن رول منٹ ریسیو یعنی شرح داخلہ اندراج کو بڑھانے کی وکالت کی گئی ہے۔ اس وقت قومی شرح 26.3 ہے اور 2035 تک 50 فیصد لے جانے کا نشانہ طے کیا گیا ہے۔ اس پر کوشش ہونی چاہیے، کیونکہ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے تعلیمی شعبے میں پسماندگی ترقی کی رفتار کو کم کرتی ہے، کیونکہ تمام شعبۂ حیات میں تبدیلی کے لیے تعلیمی شعبے میں مستحکم ہونا لازمی ہے۔

مختصر یہ کہ اس تعلیمی پالیسی میں تھوڑی بہت تبدیلی کی گنجائش نکال کر ریاستوں کو اس کے نفاذ کے لیے تیار کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ تعلیم اسٹیٹ لسٹ میں شامل ہے۔ اگر کوئی ریاستی حکومت پرائمری اور ثانوی تعلیم کو اس نئی تعلیمی پالیسی کی روشنی میں تبدیل نہیں کرتی ہے تو پھر یہ تعلیمی پالیسی ہنگامہ آرائی کا سامان بن کر رہ جائے گی۔ اب مرکزی وزارت کا نام تبدیل ہو کر وزارتِ تعلیم ہو گیا ہے ممکن ہے کہ اس تبدیلی کا اثر کچھ دکھائی دے۔ جہاں تک اس پالیسی پر موجودہ حکومت کے نظریے کا سوال ہے تو یہ جگ ظاہر ہے کہ حکومت کسی بھی سیاسی جماعت کی ہو، وہ پہلے اپنے مفاد کو دیکھتی ہے لیکن اس حکومت میں جو فیصلے ہو رہے ہیں، وہ کبھی کبھی ہماری جمہوریت اور آئین کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے بھی لیے جا رہے ہیں۔ اس پالیسی میں بھی اس نظریے کی بالادستی دکھائی دیتی ہے کہ نجکاری کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور انتظامی امور میں فرد واحد کو طاقتور بنانے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک جمہوری نظام کے ملک کے لیے مضر صحت ہے۔

سہ لسانی فارمولہ سے لاحق اردو کو خطرہ

محمد حنیف خاں

مرکز اور ریاست کی سیاست کے مابین اردو پستی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ مرکز نے نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں جو سہ لسانی فارمولہ پیش کیا ہے، اس کے مطابق بچوں کو تین زبانیں سکھائی جائیں گی۔ ریاست کی زبان، علاقائی زبان اور ایک زبان آپشنل/ اختیاری ہوگی۔ کم از کم پانچویں تک بچے کو مادری زبان میں تعلیم دی جائے گی۔ حالانکہ منصوبہ آٹھویں اور اس کے بعد تک بھی مادری زبان/ علاقائی زبان/ مقامی زبان میں تعلیم دی جائے گی۔ مرکزی حکومت کے اس منصوبے کو تمل ناڈو کے وزیرِ اعلیٰ ایڈا پاڈی کے پلانی سوامی نے مسترد کر دیا ہے۔ انھوں نے صاف طور پر کہا ہے کہ وہ دولسانی فارمولے پر کاربند رہیں گے جس میں تمل اور انگریزی ہی میں بچوں کو تعلیم دی جائے گی۔ انھوں نے اس فارمولے کو ہندی کو تھوپے جانے کی شکل میں ہی دیکھا ہے۔ ایڈا پاڈی کے پلانی سوانی کے اس فیصلے میں جہاں ان کی اپنی زبان اور تہذیب وثقافت سے محبت دکھائی دیتی ہے اور یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ انگریزی کو عالمی رابطے کی زبان مانتے ہیں وہیں اردو کے لیے ان کا یہ فیصلہ بہت خطرناک ہوسکتا ہے۔ اگر تمل ناڈو کی طرح ہی دیگر تمام ریاستیں اپنی ریاست کی زبان کو ترجیح دینے لگیں گی اور ثانوی زبان کے طور پر کوئی یوروپی زبان کا انتخاب کر کے دولسانی فارمولے پر عمل کریں گی تو اردو کہاں دکھائی دے گی؟ کوئی بھی ایک ایسی ریاست نہیں ہے جہاں کی دفتری زبان اردو ہو۔ جموں وکشمیر میں ضرور اردو سرکاری زبان تھی لیکن اس کی یونین ٹریٹری میں تبدیلی اور تقسیم کے بعد پرانی حیثیت ختم ہوچکی ہے۔ ہندی پٹی کی ریاستیں اردو بول کر اس کو ہندی کے زمرے میں شمار کرتی ہیں۔ ایسے میں تو اردو کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ جب پرائمری سطح پر اردو پڑھائی نہیں جائے گی، اس کی جگہ ہندی اور دیگر زبانیں پڑھائی جائیں گی اور ان ہی میں تعلیم دی جائے گی تو ظاہر سی بات ہے کہ اردو کی جڑ کے ساتھ ہی اس کا پودا بھی نابود ہوجائے گا۔

مرکز کی سیاست پر ہندی پٹی کے سیاست داں حاوی رہے ہیں۔ وہ ہندی کو ملک کی ایک ایسی قومی زبان کا درجہ دلانا چاہتے ہیں جسے ہر ہندوستانی لکھے، پڑھے اور بولے۔ چونکہ ہندی کا مذہبی تناظر بھی ہے، اس لیے ہندی کو مذہب کے غلبے کی کوشش کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ جب مرکز کے فیصلے کے خلاف تمل ناڈو کے وزیر اعلیٰ نے اپنے مؤقف کا اظہار کیا تو وزارت تعلیم نے ایک ٹوئٹ میں یہ واضح کیا کہ آئینی ہدایات، عوامی جذبات، وفاق کی امیدوں، کثیر لسانیت کے ساتھ قومی اتحاد کے فروغ کے لیے سہ لسانی فارمولہ جاری رہے گا۔ وزارت نے جس آئین کی بات کی ہے، اس میں تعلیم وزبان کا مسئلہ مرکز کے نہیں، ریاستوں کے دائرۂ اختیار میں

آتا ہے۔ دوم سہ لسانی فارمولہ کوئی آئین نہیں ہے بلکہ یہ پارلیمنٹ کے ذریعہ اختیار کیا ہوا ہے۔ اس فارمولے پر مرکز اور ریاست کے مابین غلبے کی سرد جنگ شروع ہوچکی ہے۔ اس کو جب اردو کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے تو دونوں تناظر میں اردو کا نقصان ہی دکھائی دیتا ہے۔ اگر سہ لسانی فارمولہ نافذ ہوتا ہے تو اس سے اردو پر کیا اثرات مرتب ہوں گے اور اگر سہ لسانی کے بجائے دولسانی فارمولہ جو تمل ناڈو کا ہے، اسے سبھی ریاستیں اختیار کرلیں تو اس سے اردو پر کیا اثر پڑے گا، اس پر غور کرنا ضروری ہے۔

مرکز کی قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے سہ لسانی فارمولے میں ریاست اور علاقائی زبان کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ دو زبانیں ہیں۔ ریاست کی زبان سے مراد وہ زبان ہے جو اس ریاست کی سرکاری، دفتری زبان ہو اور علاقائی زبان سے مراد مادری زبان ہے۔ تیسری زبان اختیاری ہے۔ اس شق کے اردو سے متعلق دو پہلو ہیں۔ اول کسی بھی ریاست کی اب زبان اردو نہیں ہے، دوم کسی بھی خاص علاقے کی زبان بھی اردو نہیں ہے، البتہ ایک معتد بہ تعداد ضرور ایسی ہے، جس کی مادری زبان اردو ہے۔ اس فارمولے کے مطابق ریاست کی زبان سے اردو ازخود خارج ہوجائے گی، پورے ملک میں کوئی ایسی ریاست نہیں ہے جہاں ریاست کی سطح پر اردو کو اسکول کے نصاب میں جگہ مل سکے۔ اسی طرح سے علاقائی سطح پر بھی اردو کا یہی حال ہے۔ یہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ علاقے کی تحدید کس تناظر میں کی جائے گی؟ اضلاع کے اعتبار سے؟ زمین کے نشیب و فراز کے اعتبار سے جس کو جغرافیائی بھی کہہ سکتے ہیں یا منطقہ کے اعتبار سے، اس کی کوئی وضاحت ابھی سامنے نہیں آئی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی صورت نہیں ہے، جس میں اردو کو جائے امان مل سکے۔ صرف تیسری شکل ہی بچتی ہے جسے آپشنل/ اختیاری کا نام دیا گیا ہے۔ بظاہر مرکز اور ریاست کی سیاست میں اردو کے لیے مرکز کا موقف بہتر دکھائی دیتا ہے لیکن اس میں بھی کئی مسئلے ہیں۔ اول اگر اختیاری زبان کے زمرے میں اردو آتی ہے تو اس کی حیثیت پہلے ہی دوم درجے کی ہوجاتی ہے۔ اختیاری مضامین کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ بس کاغذی خانہ پری کے لیے یہ کیا جارہا ہے۔ اس کی کوئی مرکزی حیثیت نہیں ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس کو پہلے ہی اس کا مقام مل جاتا۔ دوسرے اردو کے مادری زبان ہونے کا تعین کیسے کیا جائے گا۔ غیر ہندی ریاستوں میں اگر بچے اردو پڑھنا چاہتے ہیں یا مہاجر بچے جو اپنے والدین کے ساتھ ان ریاستوں میں رہ رہے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ ایسے بچوں کی تعداد یقینی طور پر بہت کم ہوگی۔ ان کے لیے اردو میں نصاب تعلیم اور ان کو پڑھانے والے اساتذہ کا کیسے انتظام ہوگا؟ مادری زبان کا تعین ہندی پٹی کی ریاستوں میں کیسے ہوگا؟ کون ہوگا جو اس کا تعین کرے گا؟ ہندی پٹی میں جو زبان بولی جاتی ہے، وہ نہ اردو ہے اور نہ ہی ہندی بلکہ ان دونوں سے ملی جلی زبان ہے جس کو مادری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ کم تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خاص اردو یا خالص ہندی کا استعمال کرتے ہیں اور ان کی مادری زبان وہی ہو۔ اس کے برعکس اردو کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا جاتا رہا ہے، اس میں اردو کو مادری زبان کی حیثیت سرکاری سطح پر نہیں دی جارہی ہے۔ اس کی جگہ ہندی تھوپی جاتی ہے۔ 2011 کی مردم شماری میں یہ دیکھنے کو ملا تھا کہ اردو کی جگہ ہندی لکھا گیا۔ اس وقت سرکاری اسکولوں میں پرائمری سطح پر جو اردو کی حالت ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایسے میں سہ لسانی فارمولے کے نفاذ کے بعد اردو پر مزید خطرات منڈلانے لگیں گے۔ یہ وہ خدشات ہیں جو مرکز کے فارمولے کے نفاذ سے اردو کو پیش آئیں گے۔

اگر تمل ناڈو کے نقش قدم پر دوسری ریاستیں چلنے لگیں اور وزیراعلیٰ کے ایڈاپاڈی کے پلانی سوامی کے فیصلے کے مطابق سہ لسانی کے بجائے دولسانی فارمولے کو اختیار کرتے ہوئے ریاست کی زبان کے ساتھ انگریزی یا عالمی رابطے کی کسی دوسری زبان کا انتخاب کرنے لگیں تو یہ اردو کے لیے نہایت خطرناک ہوگا، کیونکہ اس زبان کی نہ تو

کوئی ریاست ہے اور نہ ہی مخصوص خطہ۔ جس کی وجہ سے اس کو تو کہیں جگہ ہی نہیں ملے گی، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مرکز اور ریاست کی سیاست سے اردو کو بچایا جائے۔ کاغذی سطح پر اردو کے لیے تمل ناڈو سے کہیں بہتر منصوبہ مرکز کا ہے لیکن مرکز کا منصوبہ بھی اردو کے حق میں کاغذی سطح پر ہی ہے، کیونکہ پچھلی کھڑکی سے یہاں اردو کی جگہ ہندی کو رکھے جانے کا صرف خطرہ اور خدشہ ہی نہیں بلکہ یقین ہے۔ زبانوں اور تہذیب وثقافت کے تحفظ کی ذمہ داری یقینی طور پر حکومت کو اس جانب سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اردو جس کی ایک تاریخ، تہذیب اور ثقافت ہے، اس کے وجود کو مٹنے سے بچایا جاسکے، لیکن ان حکومتوں سے کہیں زیادہ ذمہ داری اس طبقے کی ہے جس کی وہ زبان ہے، کیونکہ تہذیب پر حملہ سب سے پہلے زبان کے توسط سے کیا جاتا ہے۔ اگر اہل اردو اپنی تہذیب وثقافت اور اپنی تاریخی روایت کو بچانا چاہتے ہیں تو ان کو اپنی زبان کے تحفظ کے لیے میدان میں آنا ہوگا۔ سماجی اور ملی تنظیموں کو مرکز اور ریاست کی سیاست سے اردو کو بچانے اور اس کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے کمربستہ ہونا پڑے گا۔ کیونکہ حکومت وانتظامیہ میں ایسے مسموم ذہنیت کے افراد داخل ہوچکے ہیں جو ایک خاص تہذیب وثقافت اور اس کے علائم سے بھی نفرت کرتے ہیں جبکہ اردو ان علائم میں سب سے اہم مقام رکھتی ہے۔ جس طرح وہ ماضی میں اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے اردو کو نقصان پہنچاتے رہے ہیں اسی طرح وہ مستقبل میں بھی اردو کے خلاف کمربستہ اور لام بند رہیں گے۔ سرکار نے پہلے ہی اپنے فارمولے میں اردو کو ثانوی درجہ دے دیا ہے۔ رہی سہی کسر مسموم ذہنیت کے افسران وحکام پوری کرکے اس کو اپنی آخری منزل تک پہنچادیں گے، اس لیے مستعد رہنے کی ضرورت ہے۔

تعلیمی پالیسی

آزادی کے بعد میکالے تعلیمی نظام سے نجات کے لیے آوازیں اٹھیں مگر پہلی تعلیمی پالیسی فوراً نہیں آئی تھ۔

- ☆ 1964: حکومت نے یو جی سی کے چیئرمین ڈاکٹر ڈی ایس کوٹھاری کی سربراہی میں ایک نئی تعلیمی پالیسی بنانے کا فیصلہ لیا۔ آزاد ہندوستان کی یہ پہلی تعلیمی پالیسی کوٹھاری کمیشن کے نام سے جانی جاتی ہے۔
- ☆ 1986: دوسری تعلیمی پالیسی بنائی گئی۔
- ☆ 2020: تیسری تعلیمی پالیسی سامنے آئی۔

نیا نظام کیا ہے؟

اس وقت 10+2 کا تعلیمی نظام نافذ ہے مگر نئی تعلیمی پالیسی کا نظام 5+3+3+4 کا ہوگا، یہ اس طرح ہوگا:

- ☆ اسکول میں بچوں کا داخلہ 3 سال کی عمر میں ہوگا۔ وہ اگلے 5 سال تک پرائمری تعلیم حاصل کرے گا۔
- ☆ 8 سے 11 سال کی عمر تک مڈل کی تعلیم مکمل کرے گا۔
- ☆ 11 سے 14 سال تک ثانوی درجے کے مرحلے طے کرے گا۔
- ☆ 14 سے 18 کے درمیان 10ویں اور 12ویں کرے گا۔

ڈگری کورس کا مطلب

نئی تعلیمی پالیسی میں کالجوں میں 4 سالہ ڈگری کورسز کے نفاذ کی بات کہی گئی ہے۔ یہ اس طرح ہوگی:

- ☆ طالب علم کے ایک سال کے بعد پڑھائی چھوڑنے پر اسے سرٹیفکیٹ کورس کی سند دی جائے گی۔
- ☆ 2 سال کے بعد پڑھائی چھوڑنے پر سرٹیفکیٹ ڈپلومہ کا دیا جائے گا۔
- ☆ 3 سال کے بعد پڑھائی چھوڑنے پر گریجویٹ کا سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔
- ☆ 4 سال مکمل کرلینے پر ڈگری کورس کا سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔ یہ طالب علم پی ایچ ڈی ریسرچ میں داخل ہونے کے اہل ہوگا۔

تعلیم

اسلامی قوانین کے مآخذ

ڈاکٹر وقار انور
Waquaranwar@yahoo.com

جب ہم کسی چیز کو اسلامی کہتے ہیں تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کسی طریقۂ کار کو اسلامی کہنے کا مطلب یہ ہو کہ جو اس کے دائرہ سے باہر ہے وہ غیر اسلامی قرار پائے؟ یہ خلافِ واقعہ بات ہے۔ بہت سے ایسے امور ہیں: مثلاً انتظامی نوعیت کے معاملات، جہاں اسلامی شریعت کا اپنا کوئی خاص تفصیلی موقف نہیں ہے، اس نے صرف اصولی رہنمائی دے کر انسان کے اپنے انفرادی اور اجتماعی فہم پر اعتبار کر کے تجربات کرنے اور اس کے مطابق فیصلہ کرنے اور پھر ضرورت ہو تو فیصلہ بدلنے کے لیے موقع رکھا ہے۔

فقہ

فقہ شریعت کے عملی احکام کو ان کے مآخذ اور تفصیلی دلائل سے معلوم کرنے کا نام ہے۔ (العلم بالاحکام الشرعية العملية من ادلتها التفصيلية)۔ یہاں 'احکام' سے مراد شریعت کی طرف سے انسان کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو قائم رکھنے اور اور ان کے آپس کے تعلقات کو درست کرنے اور اور ان میں نظم و ضبط پیدا کرنے اور ان کے تصرفات اور دائرہ عمل کو ایک حد تک محدود کرنے کے لیے دیے جانے والے تمام احکام کا مجموعہ ہے۔ اور 'الشرعية' سے مراد یہ ہے کہ وہ احکام کتاب و سنت اور دوسرے مآخذ سے واضح طور پر (صراحةً) ماخوذ ہوں یا ان کا اشارہ ملتا ہو (اشارةً) یا ان کی دلیل نکلتی ہو (دلالةً) یا ان کا نتیجہ ہوں (اقتضاءً)۔

فقہ کی درج بالا تعریف میں 'عملی' (العملية) کی قید بھی لگائی گئی ہے، جس کی وجہ سے عقائد، فلسفیانہ و کلامی نوعیت کے امور اس کے دائرہ کار سے باہر ہو گئے۔ اس طرح اس میں عمل پر ترغیب دینے والی روایات اور تقویٰ و احسان سے متعلق معاملات زیرِ غور و زیر بحث نہیں آتے ہیں۔ ایک دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس تعریف میں مآخذ کے ساتھ تفصیلی دلائل (ادلتها التفصيلية) کا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حکم کتاب و سنت کے بنیادی مآخذ کے علاوہ یا ساتھ اجماع، قیاس اور حکم شرعی معلوم کرنے کے دیگر دلائل سے ثابت ہو۔ [مجیب اللہ ندوی، فقہ اسلامی اور

دور جدید کے مسائل، دار التالیف والترجمۃ، جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ، 1993ء]

اس موقع پر یہ بات مناسب ہوگی کہ احکامِ شریعہ کے بنیادی ماٰخذ اور دیگر ذرائع پر نگاہ ڈال لی جائے۔

شریعت کے بنیادی ماٰخذ

شریعت کا بنیادی ماٰخذ وحی ہے، جس کی دو بڑی قسمیں ہیں: ایک قرآن جو اللہ کے اپنے الفاظ میں نبیؐ کی معرفت محفوظ حالت میں ہم تک پہنچا ہے اور جس کی نماز اور دیگر مواقع پر تلاوت کی جاتی ہے۔ اسے 'وحی متلوٗ' کہتے ہیں۔ دوسری قسم کی وحی وہ ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی رہنمائی کے لیے نازل کی جاتی تھی، تاکہ اس کی روشنی میں آپ خلق کی رہنمائی فرمائیں یہ وحی لوگوں تک لفظاً لفظاً پہنچانے کے لیے نہ تھی، بلکہ اس کے اثرات حضورؐ کے اقوال و افعال میں بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتے تھے اور آپؐ کی پوری سیرت پاک اس کے نور کا مظہر تھی۔ اسے 'وحی غیر متلوٗ' کہتے ہیں۔ یہ تلاوت کے لیے نہیں ہے۔[سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، سنت کی آئینی حیثیت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، 2019، صفحہ 127]

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے یہ لفظاً لفظاً محفوظ ہے۔ سنت رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا نظم اللہ تعالیٰ نے اس طرح نہیں کیا ہے (جس کی مصلحتوں پر گفتگو کا یہ موقع نہیں ہے) اس لیے سنتوں کی قسموں کا تذکرہ ضروری ہے۔ پہلی قسم ان سنتوں کی ہے جو تواترِ عملی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے منتقل ہوئی ہیں اور ان پر شروع سے آج تک امت میں ہمیشہ عمل ہوتا رہا ہے۔ دوسری قسم آپؐ کے وہ احکام اور آپؐ کی وہ تعلیمات و ہدایات ہیں جو متواتر یا مشہور روایات کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں۔ تیسری قسم میں وہ اخبارِ آحاد ہیں جن کی سند بھی قابلِ اعتماد ہے، جو قرآن اور متواترات سے بھی مطابقت رکھتی ہیں اور باہم ایک دوسرے کی تائید و تشریح بھی کرتی ہیں۔ چوتھی قسم ان اخبارِ آحاد پر مشتمل ہیں جو سند کے اعتبار سے بھی صحیح ہیں اور کسی قابلِ اعتماد چیز سے متصادم بھی نہیں ہیں۔ ان ذرائع سے جو بھی ہمیں رسول اللہ ﷺ سے پہنچا ہے وہ شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ دین میں جو چیزیں بھی اہمیت رکھتی ہے وہ سب ہمیں قرآن کے ساتھ ساتھ انہی ذرائع پر مبنی ہیں۔ [ایضاً صفحہ 127]

اس کے علاوہ وہ روایات ہیں جن کے سلسلے میں اس تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے کہ واقعی وہ آپؐ کا قول یا فعل ہیں یا نہیں یا انہیں آپؐ کی تائید حاصل ہے یا نہیں۔ ان ذرائع سے موصول روایات زیادہ تر جزوی و فروعی معاملات سے متعلق ہیں، جن پر مبنی رائیں اپنی اپنی تحقیق کے مطابق مختلف فقہی مسالک کے علماء نے اپنی رائے کے درست ہونے کے قوی امکان اور دیگر رایوں کے درست ہونے کے کمتر امکان کے موقف کے ساتھ اختیار کی ہیں۔ ان جزوی و فروعی اختلافات نے دین کے تنوع میں اضافہ کیا ہے اور اسے مختلف حالات میں قابلِ عمل بنانے اور اس میں نئی راہیں نکالنے کی سہولت پیدا کردی ہے۔ اگرچہ اختلافات میں خیر کے پہلو کے مقابلہ میں جس شر کا ہم آئے دن اپنے سماجی زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں ان کے دیگر اسباب ہیں، جن میں جزوی و فروعی معاملات کو اصولی حیثیت دینا، اپنی اور اپنے گروہ کی تحقیق کو اس درجہ درست سمجھنا کہ کسی اور رائے کا کسی درجہ میں درست ہونا خارج از امکان ہو یا کم علمی و کم فہمی یعنی دین کا مزاج ناشناسی یا گروہی عصبیتیں اور ذاتی دنیوی مفادات قابلِ ذکر ہیں۔

جن روایات پر کلام کرنے کی گنجائش ہوتی ہے وہ اصلاً پانچ اقسام کی ہیں: پہلی وہ جن کی سند قوی ہے، لیکن مضمون کسی زیادہ معتبر چیز سے متصادم ہے۔ دوسری وہ جن کی سند قوی ہے، لیکن وہ باہم متصادم ہیں۔ تیسری جن کی سند قوی ہے، مگر وہ ایسی منفرد روایتیں ہیں جن میں معنیٰ کے لحاظ سے قباحت محسوس ہوتی ہے۔ چوتھی جن کی سند میں کسی نوعیت کی کمزوری ہے، مگر معنیٰ میں کوئی قباحت نہیں ہے اور پانچویں وہ جن کی سند اور معنیٰ دونوں میں قباحت ہے۔ [ایضاً صفحہ 128]

عقائد، حلال و حرام قرار دیے جانے کے فیصلے اور اہم دینی امور، قرآن کریم اور پہلی قسم کی سنتوں پر مبنی ہیں، جب کہ اس نوع کے امور کی تائید، عمل پر ترغیب اور دیگر کم اہمیت کے امور میں

قدرے احتیاط کے ساتھ دوسری قسم کی روایات سے رجوع کیا جاتا ہے۔اور اگر ان میں کسی روایت کا ضعف شدید ہو تو دلائل کے ساتھ اسے رد کیا جاتا ہے۔

قرآن و سنت کے وہ متون ،جن سے احکام نکلتے ہوں،محدود ہیں۔قرآن کی چھ ہزار چھ سو سے زائد آیات میں صرف چار سو کے قریب ایسی آیات ہیں جن کا تعلق براہ راست عملی احکام سے ہے،جنہیں فقہ میں نصوص کہا جاتا ہے۔ ویسے ہی متن کے لحاظ سے احادیث کا ذخیرہ،ایک اندازے کے مطابق، چالیس سے پچاس ہزار کے درمیان ہے۔ان میں سے تقریباً چار ہزار احادیث احکامِ شریعت کے لیے متن کی حیثیت رکھتی ہیں۔اس طرح اسلامی قوانین کے لیے قرآن وسنت میں موجود بنیادی نصوص جن سے احکام اخذ کیے جاسکتے ہیں، چار ہزار چار سو کے قریب ہیں۔زندگی کے لامتناہی معاملات پر ان نصوص کو گہری بصیرت کے ساتھ منطبق کرنے کا عمل فقہ ہے۔ [محمود احمد غازی، محاضرات فقہ، اریب پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2010،صفحہ 38-37]

’’یعنی اصل اور بالذات اگر کوئی مآخذ ہے تو وہ صرف اور صرف قرآن مجید اور سنت ہیں۔بقیہ چیزیں اگر مآخذ ہیں تو پہلے مآخذ کی سند کی بنیاد پر ان کا مآخذ ہونا ثابت ہوتا ہے۔بہ الفاظ دیگر صرف قرآن وسنت کے بتانے سے پتہ چلا کہ کچھ اور چیزیں بھی مآخذ ہیں۔ اگر قرآن وسنت نے ان کو تسلیم نہ کیا ہوتا تو وہ مآخذ نہیں تھے۔چونکہ قرآن مجید نے انسانی عقل کے کردار کو تسلیم کیا ہے،اس لیے فقہ اسلامی کی تدوین و ارتقا میں عقل کا بھی ایک کردار ہے۔قرآن مجید نے مسلمانوں کے اجتماعی رویے کی پیروی کا حکم دیا تو پتہ چلا کہ مسلمانوں کا اجتماعی فیصلہ بھی ایک اہمیت رکھتا ہے۔اسی طرح بقیہ چیزیں ہیں جن میں ہر ایک کی سند قرآن مجید میں موجود ہے۔‘‘[ایضاً،صفحہ 91]۔

اس طرح اسلامی شریعت کے لیے بنیادی مآخذ قرآن وسنت پر مبنی دو نصوص شرعیہ کے علاوہ، ان نصوص کے حوالے اور ان کے قائم کردہ حدود میں رہتے ہوئے ،اسلامی فقہ کے ماہرین نے درج ذیل آٹھ مزید طریقوں (منہج) کی نشاندہی کی ہے۔

(الف) قیاس (ب) اجماع

(ج) استحسان (د) استصلاح/مصالح مرسلہ

(ھ) استصحاب (و) العرف والعادۃ

(ز) مذہب صحابہ اور (ح) سابقہ شریعتیں۔

ذیل میں ان کی مختصر تشریح کی جاتی ہے:

(الف) قیاس:

یہ دراصل اجتہاد کا سب سے اہم اور رائج طریقہ ہے۔اس میں کسی نئے معاملہ میں، جس سے متعلق حکم شرعی مطلوب ہے (جس کے لیے’فرع‘ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے) کا موازنہ شریعت میں پہلے سے معلوم حکم (جسے’اصل‘ کہتے ہیں) سے کرکے اور ان دونوں میں پائی جانے والی مشترک’علّت‘ (یعنی وجہ اور وصف) پر غور وفکر کر کے ماہرین فقہ نیا حکم لگاتے ہیں۔ اجتہاد کے اس طریقہ کا اصطلاحی معنیٰ ،اصل حکم میں پائی جانے والی علّت کو دوسرے نئے حکم پر منطبق کرنا ہے۔آسان زبان میں اسے’نامعلوم چیز کو معلوم چیز کے سامنے رکھ کر اس کی روشنی میں اس کا فیصلہ کرنا‘ کہہ سکتے ہیں۔[ایضاً،صفحہ 96] مثال کے طور پر شراب کے حرام ہونے کا حکم بنیادی نصوص سے معلوم ہے اور اس کی وجہ (علّت) نشہ ہے تو ہر نئی چیز’ جو نشہ آور ہو‘اس کے حرام ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔قیاس کے اسی طریقہ پر عمل کرتے ہوئے ہم جدید معیشت کے بہت سارے معاملات پر جن کی شکل بظاہر بالکل نئی ہے لیکن ان میں غرر اور ضرر کی وہ علّت پائی جاتی ہے جو پہلے سے معلوم طریقوں میں تھی تو وہی حکم لگاتے ہیں۔ مثلاً لاٹری، فیوچرس ٹریڈنگ، ملٹی لیول مارکٹنگ کے سلسلہ میں نئے فیصلے اسی طریقہ سے ممکن ہو سکے ہیں۔

(ب) اجماع:

اس سے مراد کسی شرعی مسئلہ پر امت مسلمہ کے تمام مجتہدین کا متفقہ فیصلہ ہے۔اس کی مشہور مثالوں میں حضرت ابو بکرؓ کے دور خلافت میں زکوٰۃ دینے سے انکار کرنے والے قبائل سے جہاد کرنے

کے فیصلہ پر صحابہ کرام کا اتفاق ہے اور حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں مصر کی فتح کے بعد وہاں کی زمین کو مال فئے متصور کر کے فوج میں تقسیم نہ کرنے کا صحابہ کرام کا متفقہ فیصلہ ہے۔ دراصل اس اجماع میں امت کی اجتماعی دانش اور اجتماعی حکمت شامل ہوتی ہے۔ اس کے برپا ہونے میں طویل عرصہ کی علمی کاوشیں بشمول مباحث اور اتفاق واختلاف کے مراحل سے گزرنا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ اجماع کی اہمیت کے پیش نظر ماہرین کی یہ رائے ہے کہ اس کا مقام قیاس (اجتہاد) سے زیادہ ہے، یعنی قرآن وسنت کے بعد پہلے مقام پر اسے رکھنا چاہیے۔ بہرحال اجماع کے مواقع قیاس کے مقابلہ میں کم آتے ہیں اور اجماع کو قیاس کی طرح کسی میکانیکی عمل سے نہیں گزارا جا سکتا ہے۔ اجماع کیا جانے والا کام نہیں ہے، بلکہ برپا ہو جانے والا واقعہ ہے۔ ہمارے زمانے میں بینک کے سود کو قرآن کی اصطلاح ربا کا مصداق قرار دینے پر عمومی اتفاق اس اجماع کی ایک مثال ہے۔

(ج) استحسان:

قیاس کے ذریعہ جو حکم نکالا جاتا ہے وہ ہمیشہ پسندیدہ نہیں ہوتا۔ کسی چیز کا فنّی لحاظ سے درست ہونے کا نتیجہ ضروری نہیں ہے کہ حقیقتاً اس سے ہمیشہ مفید نتیجہ برآمد ہوں۔ ایسے موقع پر زیادہ لطیف وخفی طرز کے قیاس سے ایک دوسرا نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے جو شریعت کے تقاضے سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔ عمومی اور فنی لحاظ سے درست قیاس سے جو نتیجہ نکلتا ہو، اگر شریعت کا منشا اس سے نہیں پورا ہوتا ہو یا کوئی حرج واقع ہوتا ہو، تو کسی دیگر بنیاد پر نیا حکم تلاش کرنے کے طریقہ کو استحسان کہتے ہیں۔ اس طریقہ پر سب سے پہلے فقہائے احناف نے عمل کیا، جسے بعد میں فقہائے حنابلہ و مالکیہ نے بھی قبول کر لیا۔ لیکن امام شافعیؒ نے اس کی شدید مخالفت کی۔ استحسان کی سب سے مشہور مثال میں بیع سلم کو پیش کیا جا سکتا ہے، جو آں حضرتؐ کے زمانہ میں جاری تھا اور آپؐ نے اس سے منع نہیں کیا یعنی یہ سنت تقریری سے ثابت ہے۔ اس میں غلہ، فصل سے قبل، خرید لیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک حدیث رسول سے متصادم ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں **لا تبع ما لیس عندک** [**رواه ابو داود، عن حکیم بن حزام**]۔ یعنی جو چیز تمہارے پاس نہیں ہے، اسے نہ بیچو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں جو اصول بیان ہوا، اس کے درست ہونے کے باوجود اس کے ظاہری مفہوم پر عمل کیا جائے تو سنت سے ثابت بیع سلم طریقہ پر عمل ممکن نہیں اور انسانی سماج میں لین دین کے ایک مفید طریقہ پر لگے گی۔ اب اس استثنائی صورت حال پر قیاس کر کے فقہا نے عقد استصناع یعنی صنعت وحرفت (Production and Technology) کی صورت میں بھی پیشگی آرڈر دینے اور ادائیگی کرنے کو درست قرار دیا ہے۔

(د) استصلاح / مصالح مرسلہ:

شریعت نے قصداً بہت سے معاملات میں آزادی دی ہے۔ مرسلہ کے معنٰی ہیں چھوڑا ہوا، یعنی جہاں سہولت دی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مصالح کے معتبر ہونے کے باوجود شریعت نے انہیں کسی حکم سے نہیں باندھا ہے۔ شریعت اسلامی کے ماہرین نے ان اصولوں کو تلاش کیا ہے جن کی بنیاد ان تمام امور میں جہاں فقہ کے اولین ماٰخذ قرآن، سنت، اجتہاد اور اجماع خاموش ہیں، حکم لگانے کا سرا مل سکے۔ وہ انہیں مصالح مرسلہ اور مقاصد شریعت سے موسوم کرتے ہیں۔ خصوصاً امام غزالیؒ (وفات 1111ء) نے پنچگانہ مقاصد کی دریافت کی ہے جن پر تفصیلی کام ان کے ڈیڑھ سو سال بعد امام شاطبیؒ (1388ء) نے کیا ہے۔ انہوں نے ان پانچ مقاصد کی فہرست کو برقرار رکھتے ہوئے، ان کے حصول کے مدارج پر کام کیا ہے۔ [نجات اللہ صدیقی، مقاصد شریعت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، 2009، صفحہ 25-23]۔ یہ پانچ مقاصد دراصل دین، جان، نسل، عقل اور مال پر مشتمل تحفظات ہیں جو شریعت اسلامی انسانوں کو فراہم کرتی ہے۔ ان تحفظات کی فہرست اور ان کی ترتیب میں کلام کی گنجائش ہے، جس پر پروفیسر ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی نے متذکرہ درج بالا کتاب میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ دوسری طرف بہت سے علماء کی یہ رائے بھی ہے کہ اس فہرست کے ہر مجوزہ اضافہ کو ان میں سے کسی ایک تحفظ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی معاشیات کے طلبہ کے نوٹ کرنے کی

خصوصی بات یہ ہے کہ شریعت کے مصالح اور مقاصد میں تحفظ مال بھی شامل ہے۔

(و) العرف والعادۃ:

کسی قوم، علاقہ یا زمانہ کے معاشرتی رواج اور طریقہ کا شریعت لحاظ کرتی ہے اور جب تک یہ شریعت کے احکام اور مقاصد سے متصادم نہ ہوں انہیں جاری رکھتی ہے۔ بلکہ بہت سے معاملات مثلاً قسم، حلف، اور طلاق جیسے امور میں کوئی حکم لگانے سے پہلے معاملہ کا صحیح فہم و ادراک حاصل کرنے کے لیے ان سے رجوع کرنا مناسب ہوتا ہے۔ اس وقت متعلقہ فرد اور اس کی قوم یا علاقہ کا عرف اور ان کی عادت کی بہت اہمیت ہو جاتی ہے۔ ایک ہی لفظ، عبارت یا طریقہ ادائیگی دو الگ الگ عادات کے لوگوں میں الگ الگ مفہوم یا شدت کا حامل ہوسکتا ہے۔ اس کو سمجھے بغیر حکم لگا دینے میں انصاف کے بجائے ظلم ہو جانے کا امکان ہے۔ البتہ اس طریقہ سے کسی حکم کی ایجاد نہیں ہوسکتی ہے، صرف حکم لگانے میں عرف و عادات کا لحاظ کیا جائے گا۔ جن امور میں عرف و عادات کی اہمیت ہے ان میں کاروباری لین دین یعنی بیع بھی شامل ہے۔

(ز) مذہب صحابہ:

کسی نئے معاملہ میں حکم کی تلاش میں شریعت کا منشا سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسے موقع پر فہم دین کا ایک اور ذریعہ اور ماخذ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کا قول و عمل بھی ہے۔ اس کی دو بنیادی وجوہ ہیں: ایک یہ کہ وہ سب عادل ہیں، جنہوں نے کبھی آں حضرتؐ سے منسوب کر کے کوئی غلط روایت بیان نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ زمانی لحاظ سے وہ رسول اللہ ﷺ سے سب سے زیادہ قریب تھے، اس لئے ان کا فہم دین سب گروہوں سے زیادہ بہتر ہے۔ صحابہ کے مذہب اور طریقہ کے لیے آثار صحابہ کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی تھی۔ جن امور میں بہت ہی قیمتی اور تفصیلی آثار صحابہ محفوظ ہیں ان معیشت و کاروبار سے متعلق معاملات بھی ہیں، کیوں کہ ان کی ایک بڑی تعداد تجارت بشمول بین الاقوامی تجارت سے وابستہ رہی ہے۔

(ح) سابقہ شریعتیں:

اسلامی قوانین کے ماخذ میں سابقہ پیغمبروں کی شریعتیں دو شرطوں کے ساتھ شامل ہیں: ایک شرط یہ ہے کہ ان میں ترمیم یا تبدیلی قرآن نے نہ کی ہو اور دوسری یہ کہ ان کا ہم تک پہنچنا قابل اعتماد وسائل سے ہوا ہو۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ نے اس کی مثال میں رجم کے قانون کا حوالہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ اگرچہ قرآن کریم میں شادی شدہ لوگوں کے زنا سے متعلق سزا کا ذکر نہیں ہے، لیکن توریت میں ان کے رجم کیے جانے کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے۔ قرآن نے سکوت کے ساتھ اس پرانے قانون کو جاری رکھا۔ دوسری طرف توریت میں غیر شادی شدہ افراد کے لیے زنا کی سزا مالی جرمانہ مذکور ہے، جسے قرآن نے تبدیل کر کے سو درّے لگانے کا حکم دیا۔" تو اس طرح دو اسلامی قانون ہوئے اور دونوں پر عمل واجب ہوا۔" [محمد حمید اللہؒ، خطبات بہاول پور، فرید بک ڈپو پرائیویٹ لیمیٹیڈ، نئی دہلی، 2004، صفحہ 103_102]۔ اس ماخذ قانون نے سہولت کا ایک دروازہ کھول دیا ہے اور اس کے مطابق حکم شرعی کی دریافت میں پرانی شریعتوں کی طرف رجوع کرنے کا موقع آسکتا ہے۔ بہرحال کسی سہولت کی موجودگی کا اعتراف نہ کرنا ناشکری ہے، لیکن اس کا مطلب لازماً ہمیشہ اس سے مستفید ہونا نہیں ہے۔

اسلامی معاشیات اور فقہ المعاملات المالیۃ

ماخذ شریعت کی درج بالا گفتگو کے بعد ضروری ہے کہ اس بات کا اعادہ کر لیا جائے کہ معاشیات اور فقہ کے منہج اور اپروچ میں کیا فرق ہے؟ فقہ کا دائرۂ کار کسی متعلقہ معاملہ کا درست و نادرست ہونا اور ان کی حدیں متعین کرنا ہے، یعنی یہ طے کرنا ہے کہ وہ فرض ہے یا واجب یا مندوب یا مباح یا مکروح یا حرام۔ معاشیات کے لیے یہ حکم صرف پہلے درجہ میں مفید ہے۔ اسے اس سے آگے مختلف جائز امور کے درمیان انتخاب، ان کی درجہ بندی اور ان کے ذریعہ انسانوں کی دنیاوی فلاح کے لیے استعمال بشمول ادارہ سازی کے امور پر توجہ مرکوز کرنی ہوتی ہے۔ مزید براں مروجہ معاشیات سے الگ اسلامی معاشیات کی فکر مندی یہ بھی ہوتی ہے کہ معاشی عمل انسانوں کے فلاح دنیا کا ضامن بھی ہو اور ان کے اخروی فلاح کو بھی متاثر نہ کرے۔

کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟

سالک دھامپوری

میں ایک کام سے گھر سے نکل کر دوسرے محلے میں جا رہا تھا۔سڑک پر لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ میں نے سامنے سے آنے والے ایک نوجوان کو سلام کیا۔اس نے سلام کا جواب دیا پھر تھوڑی دور جا کر وہ ٹھہر گیا اور اس نے مجھے آواز دی۔

''ارے جناب! ٹھہریے تو ذرا......''

میں رک کر اس کی طرف گھوما۔ وہ میرے نزدیک آ کر رک گیا۔ مجھے بڑے غور سے دیکھنے کے بعد وہ اچانک بولا: ''کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟''

میں اس کا سوال سن کر سب کچھ سمجھ گیا تھا کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا تھا اور اس کی حیرت کا سبب بھی میں جان گیا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے اس سے سوال کیا: ''آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟''

اس نے جواب دیا: ''آپ نے مجھے سلام کیا ہے میں نے سمجھا کہ آپ مجھے جانتے ہیں لیکن میں نے آپ کو قطعی نہیں پہچانا۔''

میں یہ تو سمجھ گیا تھا کہ اس کو میرے سلام کرنے سے حیرت کیوں ہوئی تھی۔ دراصل یہ اس اکیلے نوجوان ہی کی بات نہیں۔ آج ہمارے مسلم معاشرے میں ۹۰ فیصد افراد اسی بیماری کا شکار ہیں۔ آج ہم سلام صرف واقف کار کو ہی کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو دو واقف کار بھی آمنے سامنے سے یوں ہی گزر جاتے ہیں پر ان میں سے کوئی ایک دوسرے کو سلام نہیں کرتا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر مسلمان کو اللہ نے سلام کرنے، اس کو رواج دینے اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہی اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی تعلیم ہے۔

میں نے اس نوجوان سے کہا کہ میں تو تمھیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم میرے دینی رشتے سے بھائی ہو۔کلمہ گو ہو اور یہ کہ مجھے اپنے مسلمان بھائی کو سلام کرنا چاہیے۔تمھیں میرے سلام کرنے پر جو حیرت ہوئی۔ اس میں تمہاری اپنی کوئی غلطی نہیں بلکہ یہ ساری خرابی ہمارے موجودہ مسلم معاشرے کی ہے۔ جو آج اسلامی تعلیمات اور اللہ اور رسولؐ کے احکامات سے اپنا دامن چھڑا کر غیر اسلامی نظریات اور رسم و رواج کا بری طرح شکار ہو گیا ہے۔آج مسلم معاشرے کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے اور برے اور اونچے اسٹیٹس پر اپنے کو پہنچانے والا درمیانی طبقہ بھی اپنے بچوں کو خدا حافظ یا سلام کرنے کے بجائے ٹاٹا، گڈ مارننگ اور بائے بائے سکھا رہا ہے۔

یہ نوجوان جس کا نام اسلم تھا کہنے لگا: ''میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں اس لیے مجھے یہ باتیں معلوم نہیں۔ میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا ہوں کہ جب دو ملنے والے، دو دوست یا رشتے دار ملتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو سلام کر لیتے ہیں۔ یہ سلام کیا ہے؟ کیوں کیا جاتا ہے؟ یہ سب مجھے معلوم نہیں۔''

میں نے اسلم کو بتایا کو سلام ایک دعا ہے جو ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو دیتا ہے۔سلام کا مطلب ہے ''تم پر اللہ کی سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت و برکت ہو'' سلام کا جواب دینے والا

بھی سلام کرنے والے سے کہتا ہے ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' یعنی تم پر بھی اللہ کی سلامتی ہو اور رحمت وبرکت ہو۔''

سلام کے بارے میں اسلم کو یہ بات بڑی عجیب لگی اس نے کہا: ''آپ نے پہلی بار مجھے بتایا۔ میں اس وقت ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں مجھے جلدی ہے لیکن میں آپ سے پھر ملاقات کر کے تفصیل سے سنوں گا۔''

میں نے اسلم کو اپنا پتہ بتایا اور وہ سلام کر کے واپس چلا گیا۔

دو تین دن بعد وہ میرے گھر آیا میں نے اس کو کمرے میں بٹھایا۔ کچھ دینی کتابیں اس کو پڑھنے کو دیں۔ اس کی چائے وغیرہ سے تواضع کرنے کے بعد میں نے اس کو بتایا:

''دیکھو اسلم میاں! یہ تو میں نے تم کو بتا دیا تھا کہ سلام ایک دعا ہے جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دیتا ہے۔ سلام کا مطلب ہے تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔''

(۱) اللہ کے رسول محمد ﷺ نے فرمایا ہے:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! تم جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لاؤ اور مومن نہ ہو گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا میں تم کو وہ عمل نہ بتا دوں کہ جب اسے کرو گے تو آپس میں محبت کرو گے۔'' (بخاری)

لوگوں نے عرض کیا بہتر ہے۔

آپ نے فرمایا: ''آپس میں سلام کیا کرو جب تم اپنے بھائی سے ملو تو سلام کرو چاہے وہ دن میں دس بار ملے۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم سلام کرو مسلمان کو چاہے تم اسے جانتے ہو یا نہ جانتے ہو۔'' (ترمذی)

نبی ﷺ بذاتِ خود سلام کرنے میں بڑی جلدی فرماتے تھے جو بھی آپ کے سامنے آتا، چاہے وہ بچہ ہو یا بڑا، آپ اس کو پہلے خود سلام کرتے تھے۔

(۲) میں نے اسلم سے معلوم کیا۔ ان ساری باتوں کو جاننے کے بعد کیا تم اب بھی کسی نئے شخص کے سلام کرنے پر حیرت کرو گے؟ وہ بولا:

''اب مجھے کوئی حیرت نہ ہو گی بلکہ اب تو مجھے یہ جان کر حیرت ہو رہی ہے جس سلام کو کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہو اور جس سلام کو عام کرنے کے لیے کہا ہو اس پر ہم مسلمان بہت کم عمل کرتے ہیں۔

میں نے اسلم کو بتایا کہ اسلام ایک مذہب ہی نہیں بلکہ وہ ایک نظام ہے ایسا نظام جس کے تحت انسان کی پوری زندگی کے ہر مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ وہ محض پوجا پاٹ کی حد تک کوئی مذہب نہیں بلکہ وہ ایک آفاقی طریقہ زندگی ہے جو اللہ نے اپنے پیغمبر محمد ﷺ کے ذریعے تمام انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے نازل کیا ہے۔ اسلام مسلمانوں کی جاگیر نہیں ہے یہ تو سارے انسانوں کی امانت ہے جس طرح سورج کی روشنی، ہوا، پانی دنیا کے دیگر سامان زندگی ہر انسان کے لیے ہیں اسی طرح اسلام بھی ایک ایسی نعمت ہے جو ہر انسان کی اپنی امانت ہے۔

دراصل آج اسلام کی بہت سے اہم اور ضروری باتوں کو غیر اہم بتا کر چھوڑ دیا گیا ہے اور غیر اہم اور غیر اسلامی چیزوں کو اسلامی بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس لیے اسلام دشمن لابی نے ہر جگہ مسلمانوں ہی میں دولت کی چمک دمک دکھا کر اسلامی ادارے قائم کر رکھے ہیں اور زر پرست اور دولت کے اندھے علماء ان اسلام دشمنوں کے آلہ کار بنے بیٹھے ہیں، جو اسلام کی بنیادی تعلیمات میں تحریف کا کام کرنے کے لیے کافی سرگرم ہیں۔ یہ لوگ اب تک سود، بیمہ پالیسی، جوئے سٹے بازی، حصص اور سور کے اجزاء وغیرہ کو مختلف حیلوں بہانوں سے اسلامی جواز عطا کر چکے ہیں۔

دین کی صحیح سمجھ اور اسلامی حقیقی تعلیمات کو اسلام دشمنوں سے بچانے کے لیے مسلمانوں کو سنجیدگی کے ساتھ ایک لائحۂ عمل تیار کرنے کی سخت ضرورت ہے اور اسلام کی حقیقی تعلیمات اور اللہ کے احکامات کی دعوت لوگوں کو دینے کی سخت ضرورت ہے، جس اسلام کو ہم لوگ اپنی زندگی میں عملی طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہم جو کچھ کہیں اور بولیں اس پر خود بھی عمل کریں۔